اس کے عینی شاہد ہیں، جنگ آزادی کے متعلق دو کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں، جو ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۸ء کے واقعات اور سیاسی کوائف پر مشتمل ہیں، ان میں متحدہ ہندوستان کے ان عظیم رہنماؤں کا بھی مفصل ذکر ہے، جن کا ملک کی آزادی اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ رہا ہے، جناب سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق بمبئی نے دونوں کتابوں کے وہ حصے جن کا بانی پاکستان محمد علی جناح سے تعلق ہے سلیقہ سے مرتب کرکے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب قائد اعظم کے ابتدائی خانگی واقعات اور ان کی رومانی شادی سے شروع اور ملک کی تقسیم کی داستان پر ختم ہوتی ہے، اس میں اُن کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے اہم حالات، نجی زندگی کے بعض دلکش پہلو، اُن کی قد آور شخصیت کے مختلف النوع جلوے، بے داغ کردار کے بلند نمونے، ہندو و مسلمان دونوں میں انکی مقبولیت وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے مسٹر جناح کی قوم پروری کا خصوصیت سے تذکرہ کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ حقیقۃً وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے، انھوں نے پاکستان کی بازی نہیں جیتی، بلکہ کانگریسی لیڈر نہرو اور پٹیل بازی ہار گئے، پاکستان کے قیام کی ذمہ داری عموماً تمام مسلمانوں اور مسٹر جناح پر ڈالی جاتی ہے لیکن خود ہندو مفکرین و مورخین کی نظر اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی پڑنے لگی ہے، چنانچہ مصنف کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، تاہم بہت سے لوگوں کو اب بھی اس سے اختلاف ہوگا، لیکن مصنف مسٹر جناح کے خاص دوستوں میں ہیں، برسوں اُن کے ساتھ کام کر چکے ہیں، اُن کی زندگی کے سارے نشیب فراز اور جنگ آزادی کے ہر مرحلہ سے پوری طرح واقف ہیں، اس نے مسٹر جناح کے بارہ میں اُن کی رائے بڑی وقیع ہے، اس کے علاوہ انھوں نے یہ سب کچھ اپنی تحریری یادداشتوں کی روشنی میں لکھا ہے، اسلئے اسکی حیثیت مستند تاریخی دستاویز کی ہوگئی ہے، یہ کتاب تنہا مسٹر جناح کی داستان حیات نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی گذشتہ نصف صدی کی سیاسی سرگذشت بھی ہے، اور اس سے جنگ آزادی کی پوری تاریخ اور اس کے لیڈروں کے خدمات کی تفصیل بھی سامنے آجاتی ہے، اس کے ترجمے سے اردو کے ذخیرہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے،

"ض"

جلد ۱۰۶ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۵

## مضامین



## مقالات

# شذرات

اردو کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویز ہے جو بظاہر اُس کی ہمدردی میں کیجارہی ہے کہ اگر اُردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے تو ہندی والوں کی مخالفت ختم ہوجائیگی، اور وہ اردو کو قبول کرلیں گے، اُردو کے مخالفین کی طرف سے تو یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے کسی جھگڑے کے بغیر خود اردو والوں کے ہاتھوں انکا مقصد حاصل ہوجاتا ہے لیکن اردو کے بعض دوستوں کی طرف سے اس کی تائید حیرت انگیز ہے، یہ صحیح ہے کہ رسم الخط بدل جانے سے زبان ختم نہیں ہوجاتی لیکن اردو کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے، اردو ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، دونوں کے قواعد ایک ہیں مصادر ایک ہیں، ضمیریں ایک ہیں، بہت سے اسماء مشترک ہیں اگر اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھا دئے جائیں، تو وہ ہندی بن جائیگی، اور ہندی میں عربی اور فارسی کے الفاظ بڑھا دیے جائیں، تو وہ اردو ہوجائے گی ان دونوں میں مابہ الامتیاز صرف رسم الخط ہے، اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے، تو وہ چند دنوں میں ہندی کا قالب اختیار کرلے گی، اور ہندی والوں کے رد و قبول کا سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا،

......

رسم الخط بدلنے سے اُردو کی بہت سی خصوصیات مٹ جائیں گی، اُس کی مختصر نویسی، اس کے حروف، الفاظ کے تلفظ کی صحت و شائستگی اور اُس کا حُسن سب غارت ہوجائیں گے، خط نستعلیق اتنا حسین و دلکش ہے کہ نستعلیق کی اصطلاح ہی مہذب شائستہ اور کڑھے ہوئے آدمیوں کے لئے استعمال ہونے لگی، نسخ



اور نستعلیق کے فنکاروں نے خطاطی کو ایک فن لطیف بنادیا، اور ایسے ایسے بوقلموں اور حسین و جمیل خط ایجاد کئے گئے جو آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں، اور جن کی صناعی اعلیٰ درجہ کی مصوری کی ہمسری کرتی ہے، یہ سب آثار قدیمہ کے کتبات بن جائیں گے، رسم الخط بدلنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اردو کا سارا علمی ذخیرہ جو صدیوں کی محنت و جانکاہی کا نتیجہ ہے، برباد ہوجائے گا، اس کا دیوناگری میں منتقل کرنا ناممکن ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی ذخیرہ عربی کے بعد اردو ہی میں ہے، اور عربی سے ناواقف مسلمانوں کی معلومات کا تنہا ذریعہ ہے، اس سارے ذخیرے سے وہ محروم ہوجائیں گے،

اردو رسم الخط کی بین الاقوامی اہمیت یہ ہے کہ وہ وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ تک سارے اسلامی ملکوں میں رائج ہے، ایشیا اور افریقہ کے وہ اسلامی ملک بھی جن کی زبان اور رسم الخط عربی اور فارسی سے جدا ہے، قرآن مجید اور مذہبی تعلیم کی بدولت اردو رسم الخط سے بیگانہ نہیں ہیں، ان کے یہاں عربی کی تعلیم اسی کے رسم الخط میں ہوتی ہے، اور ان کی زبانوں میں بھی اسکے گہرے اثرات ہیں، اس لئے اردو رسم الخط ان ملکوں سے ربط و تعلق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، یاد ہوگا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب تاشقند گئے تھے، تو وہاں کے باشندوں نے السلام علیکم سے اُن کا استقبال کیا تھا، پنڈت جی نے بھی اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا تھا اور لال بہادر شاستری نے تاشقند میں کسی رجسٹر پر اُردو میں دستخط کئے تھے جس کو ہندوستان کے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا اس لئے جو لوگ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کے ایک بڑے رشتے کو کمزور کرتے ہیں،

اس سلسلہ میں ترکی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی مثال پیش کرنا کئی وجہوں سے صحیح نہیں ہے وہاں ترکی کی کوئی ایسی حریف زبان موجود نہیں تھی، جن میں اتنی قربت اور مشابہت ہو جتنی اردو اور ہندی میں ہے، اور جن میں صرف رسم الخط کا فرق ہو، بلکہ وہاں ترکی کے علاوہ کوئی دوسری زبان ہی نہیں ہے، اس لئے رسم الخط کی تبدیلی سے اس کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، دوسرے اس نے ایک بالکل اجنبی رسم الخط اختیار کیا،

جس کا ترکی میں پہلے کوئی وجود نہ تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ترکی پوری قوم کی زبان ہے اسلئے اس کو کسی حال میں بھی نقصان پہنچنے کا امکان نہ تھا، اردو کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، وہ ہر سمت سے زد میں ہے، ایک سمت رسم الخط کی تبدیلی کی بھی ہے، پھر بھی رسم الخط کی تبدیلی سے ترکی قوم کو یہ نقصان ضرور پہنچا کہ اس کی نئی نسل اپنے پرانے ذخیرہ سے بیگانہ ہو گئی، لیکن ترکی قوم اور حکومت دونوں کی زبان ہے، اس نے اس کی تلافی کی کوشش بھی جاری رہی، اور حکومت کی سرپرستی ہر نقصان کی تلافی کر سکتی ہے، اس کے مقابلہ میں اردو حکومت کی سرپرستی سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس کو سب سے زیادہ نقصان اسی سے پہنچا ہے، جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، ترکی کے رسم الخط کی تبدیلی بھی مصطفےٰ کمال کی ایک ازج تھی، جس کو پوری قوم نے دل سے قبول نہیں کیا تھا اسلئے ترکی سے عربی رسم الخط کا بالکل خاتمہ نہیں ہو گیا اور وہاں آج بھی عربی رسم الخط میں بھی کتابیں چھپتی ہیں،

اردو رسم الخط کی بعض خامیوں سے انکار نہیں لیکن خامیوں سے کسی زبان کا رسم الخط بھی خالی نہیں، اس سے اردو کی ابتدائی تعلیم میں ضرور دقت ہوتی ہے، لیکن اس کی اصلاح کی کوششیں بھی جاری ہیں اور ماہرین تعلیم نے ایسی ریڈریں تیار کر دی ہیں، جن سے یہ دقتیں بڑی حد تک دور ہو گئی ہیں، اردو کی پوری تعلیم کے بعد پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی، اس کے لکھنے پڑھنے دونوں میں اتنی تیزی اور روانی پیدا ہو جاتی ہے، کہ ہندوستان کی کوئی زبان اس میں اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندی لکھنے پڑھنے میں جتنا وقت اور تحریر و کتابت کے جس قدر لوازم صرف ہوتے ہیں، اردو لکھنے پڑھنے میں اس سے کہیں کم صرف ہوتے ہیں اور پڑھنے میں صرف نگاہ کا کام کرتی ہے، اس لئے اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں بلکہ سراسر مضر ہے، البتہ یہ تجویز مناسب ہے کہ ہندی والوں کے استفادہ کے لئے اردو کی بعض ضروری اور اہم کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھی اور شائع کی جائیں، اس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض مذہبی جماعتیں اپنا مذہبی لٹریچر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کر رہی ہیں، اور امید ہے کہ یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا،







# مقالات

## ادبی سرقات

## کلامِ غالب کی روشنی میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

اب ذرا ان اشعار کے تجزیہ کی بھی ضرورت ہے، جن پر سرقہ کا الزام رکھا گیا ہے، تمام اشعار کا تجزیہ تو نہ ہو سکے گا، لیکن کچھ اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ سرقہ کے الزام کی نوعیت کیا ہے،

غالب: تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عرفی: طغیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل — آید بزیر تیغ و شہیدش نمی کنند

عرفی کے شعر کا مطلب یگانہ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ رے وفورِ ناز کہ فدیۂ عشق تلوار کے نیچے آکر بھی شہادت سے محروم ہو جاتا ہے، طباطبائی نے غالب کے شعر کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "اپنی رسوائی اور موردِ تعزیر ہونے کا اظہار ہے کہ لوگ اسے تماشا سمجھے ہوئے ہیں"، اگر یہ مطلب تسلیم کر لیا جائے تو پھر دونوں شعروں کے معانی میں بڑا فرق پیدا

ہو جاتا ہے، اور اگر غالب کے شعر سے معشوق کا استغنار مراد ہے، تو پھر اس کے یہ معنی بھی لئے جا سکتے ہیں، کہ معشوق نے مار مار کر غالب کے پرزے نہیں اڑائے، اسی لئے اس کے اڑ جانے کا تماشا نہ ہوا، آسی نے غالب کے اس شعر کی شرح میں مذکورۂ بالا فارسی شعر کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کہنہ مشق شاعر غالب نے ایک معمولی پامال مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا ہے، کہ نہایت بلند خیال معلوم ہوتا ہے، اگر شعر میں یہ مضمون اس صورت میں لایا جاتا، کہ غالب تیرے قتل کا وعدہ کیا گیا تھا اور تو وہاں گیا، مگر قاتل نے قتل نہیں کیا تو شعر جیسا کچھ ہوتا ظاہر ہے غرض کہ ایک رکیک خیال کو چست بندش انوکھا خیال بنا کر دکھا دیتی ہے، ایک فارسی شعر اسی خیال سے لبریز ہے، مگر سچ یہ ہے کہ جس صورت سے معشوق کی بے اعتنائی کو ایک بیش پا افتادہ مضمون سے شاعر یعنی غالب نے حسن بندش کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ ایک تصویر ہے، جس کے دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتیں، (ص ۵۵)

غالب: فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اسکو اسدؔ　　　جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

شاگرد مصحفی :-

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں　　　کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ لکھتے ہیں کہ غالب نے شیخ مصحفی کے ایک شاگرد کے مشہور و معروف شعر کی نقل کی ہے، طبا طبائی نے غالب کے شعر کی شرح میں صرف اتنا لکھا تھا

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　　کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ پر بھی تو سرقہ کا الزام آتا ہے کہ طبا طبائی کی شرح کو اپنی تحقیق میں داخل کر لیا پھر کیا یہ سرقہ اس لئے ہے کہ شعر میں فلک اور معشوق کی ستمگاری کا اشتراک دکھایا گیا ہے یہ تو



ہر شاعر کے یہاں پایا جائے گا، آسی نے غالب کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح کرتے وقت یہ بھی کہا ہے کہ غالب نے اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے،

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یہ تو غالب کی قادر الکلامی کی دلیل ہے کہ غزل کے ایک مضمون کو وہ نوع بنوع ادا کر سکتے ہیں،

غالب: میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!

نامعلوم: یاد آیام جنوں بر سر من بار دو سنگ　　　کود کاں را چو ز مکتب کسے آزاد کنند

یگانہ فارسی شعر کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ لڑکے جب مکتب سے چھٹی پاتے ہیں تو انھیں دیکھ کر اپنے ایام جنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس یاد سے گویا اس شخص کے سر پر پتھر برسنے لگتے ہیں! یگانہ اس شعر کی تو تعریف اسطرح کرتے ہیں کہ "کہنے والا کس خوبی سے کہہ گیا" مگر غالب کے شعر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شعر جتنا مشہور ہے اتنا ہی مہمل ہے، مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے، اور دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکز خیال قائم ہی نہیں ہوتا، "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" اگر غالب کا شعر سرقہ ہوتا تو نقل اصل کے برابر ہوتی مہمل نہ ہو جاتی، اور پھر دونوں شعر کا جو مطلب ہے، وہ سرقہ نہیں کہا جا سکتا، جنون اور سنگ تو عامۃ الورود ہے اس کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا ہے،

غالب: ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

عبداللہ پیامی :-

ہم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من　　　از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

یگانہ نے فارسی شعر کے معنی یہ بتائے ہیں کہ شاعر کہتا ہے کہ تو مجھ سے وعدہ کرنے
اس امر کا اندیشہ نہ کر کہ وفا بھی کرنا پڑے گا کیونکہ وعدہ کی خوشی مجھے آج سے کل تک
پہونچنے ہی نہ دے گی، آج ہی خوشی کے مارے مر جاؤں گا، اس شعر کو دیکھ کر غالب
کی چوری یا نقالی کی حقیقت کھلتی ہے، غالب پرست ہزار سر پٹکیں ایسی چوری کی
لیپا پوتی نہیں ہو سکتی، غالب کا شعر بقدر دانی رسم کی شانِ بلاغت کو نہیں پہونچ
سکتا، اس کے علاوہ پیامی کے شعر میں بہم از وفا مدار کے فقرہ سے جو معنوی خوبی
میں اضافہ ہو گیا ہے، وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے اور آمادہ کیا ہے
اس کے مفہوم کا غالب کے شعر میں پتا تک نہیں، یگانہ کے اس اعتراض کا جواب
نظامی بدایونی نے غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے یہ لکھ کر دیا ہے، کہ فارسی شاعر
نے اپنے شعر میں صرف یہ بیان کیا ہے، کہ وعدۂ وصل کرنے میں اس خیال سے پس و
پیش نہ کر کہ اس کا ایفا کرنا پڑے گا، کیونکہ میں تیرے وعدہ کی خوشی میں کل تک
زندہ ہی نہ رہوں گا، اور نہ میں ہوؤں گا نہ مجھے وعدہ ایفا کرنے کی نوبت آئیگی
ایک غیر انصاف پسند نکتہ چین نے غالب کے اس شعر کو فارسی شعر کا ترجمہ لکھا ہے،
لیکن اُس نے غور نہیں کیا، کہ غالب کے شعر میں جو چلبلا پن پایا جاتا ہے، اور اس
کے سننے سے سامع کے دل میں جو اثر ہوتا ہے، فارسی شعر میں اس کا پتا نہیں،
وعدے کو جھوٹ جان کر اس پر زندہ رہنا ایک نئی بات ہے،

غالب: اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب / لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

ظہیر فاریابی:- صدمہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول / کے شناسد طفل قدرِ سیلیِ استاد را



یگانہ کہتے ہیں کہ پامال مضمون ہے، بہتیروں نے کہا ہے، اس میں میں ظہیر فاریابی
بھی ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ظہیر فاریابی نے بھی کہیں سے سرقہ کیا ہے، آسی لکھنوی
نے بھی غالب کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح میں ظہیر فاریابی کا شعر نقل کیا ہے، معلوم
نہیں آسی اور یگانہ دونوں میں کس نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے، مولانا
نے ان دونوں اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب مصائب
روزگار یا حوادثِ ارضی و سماوی کی تمثیل اہلِ عقل کے لئے سیلی استاد کا (استاد
کا طمانچہ) سے کرتا ہے، اور اس طرح استقلال اور بلند ہمتی کی روح پھونکتا ہے، اور
ظہیر فاریابی عشق و ہوس کی امتیازی خصوصیت کو سیلیِ استاد سے مثال دیتے
ہیں، بیخود موہانی نے بھی ان دونوں اشعار کا موازنہ اس طرح کیا ہے "میرے
نزدیک غالب کا مضمون نہایت وسیع ہے، علاوہ اس کے اس نے طوفانِ حوادث
کو مکتب قرار دیا ہے، مکتب کا ہنگامہ خواہ لڑکوں کے پڑھنے سے پیدا ہو، یا سیلی استاد
کا نتیجہ ہو، اس سے طوفان کے جوش و خروش کا عالم نظروں میں پھرنے لگتا ہے،
دوسری لطافت یہ ہے کہ (لطمہ) موج کے تھپیڑے اور اُستاد کے طمانچے میں کیسی
زبردست مشابہت ہے، یہ لفظ اپنے معنوں کی تصویر ہے، پھر شعر کا ایک ہی تلازمہ
بحر میں ختم ہو جانا، بھی اثر شعر کا کفیل ہے، غالب کہتا ہے کہ اہلِ بینش کے لئے کوئی
حادثہ ہو سبق آموز ہے،..... ظہیر نے بوالہوس (ہوس پرست) کو باعتبار نادانی
طفل کہا ہے، اور صدمۂ عشق کو سیلی استاد سے تعبیر کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ صدمہ
کی لفظ قریب قریب اسی شان کی رکھ دی، جیسی غالب کے شعر میں لطمۂ موج ہے،
صدمہ کے معنی لغت میں ٹکرانے کے ہیں یہ لفظ بھی بیانِ واقعہ کو واقعہ بنا رہا ہے، جب

یوں ہے تو کوئی شعر ندرت سے خالی نہیں،

(گنجینۂ تحقیق از بیخود موہانی ص ۱۷۳-۱۷۲)

غالبؔ: کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

؟ زخضر عمر فزون است عشق بازاں را
اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را

؟ عمر من گیرم کہ باشد عمر تا روزِ حساب
زیستن بے تو نباشد در حسابِ زندگی

یگانہ نے فارسی شعر نقل تو کر دیا، لیکن شاعر کا نام بتا نہیں سکے ہیں، شاید کہیں سے لے لیا ہو، بیخود موہانی نے پہلے فارسی شعر کو بیتھری کا بتایا ہے، آسی نے خسرو کا ایک ہم معنی شعر اور لکھا ہے،

زہے عمر دراز عاشقاں گر
شب ہجراں حساب می گیرند

غالبؔ نے خسرو کے اس شعر سے استفادہ کیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ وہ ہندوستان نژاد فارسی شعراء میں خسرو ہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے،

غالبؔ: مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے،
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

جامی: آسماں جامِ نگوں واں کز مئے عشرت تہی است
جُستن مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است

یگانہ لکھتے ہیں کہ وہی آسماں، وہی جامِ واژگوں، وہی مئے عشرت کی ہوس جو یہاں ہے سو وہاں، چوری نہیں تو کیا ہے، آسی نے بھی غالب کے اس شعر کی شرح میں جامی کا شعر نقل کیا ہے، بیخود موہانی کا بیان ہے کہ دونوں شعر کا مبحث تو ایک ضرور ہے لیکن مضمون ایک نہیں، جامی کا رنگ واعظانہ ہے، غالب کا رنگ شاعرانہ ہے،



دونوں میں واقعہ اور بیان کا فرق ہے، ایک پیکر بے جان ہے، اور ایک پیکر ذی روح، جو بر جستگی غالب کے شعر میں ہے جامی کے یہاں نہیں، (گنجینۂ تحقیق ص ۱۸۰-۱۷۹)

غالبؔ: ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

صائبؔ: سرِ مینائے مے و ہمت اورا نازم
کہ گرفتہ است گناہ دو جہہ بر گردنِ خویش

دونوں شعر میں خلق خدا کا خون گردنِ مینا پر ضرور رکھا گیا ہے، لیکن غالبؔ کے دوسرے مصرع سے شعر میں جو بانکپن بلکہ صحیح تغزل پیدا ہو گیا ہے، وہی اصلی جان ہے، جو صائبؔ کے یہاں نہیں،

غالبؔ:- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنی حدوں میں پورا ہے، زباں زد خاص و عام ہے، مگر پرایا مال ہے، عاقل خاں رازی کہتا ہے،

بصد آبرو رقیب از سر کوئے تو جدا
اول این حادثہ بر آدم و حوا گزشت

لیکن نظامی بدایونی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عاقل خاں رازی نے بھی فارسی میں اس مضمون کو لکھا ہے، لیکن غالبؔ کے یہاں بہت بے آبرو ہو کر کے ٹکڑے نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ فارسی شعر میں کہاں؟ اس مصرع کو بہت کے لفظ پر پورا زور دے کر پڑھنے سے شعر کے معنی حاصل ہوتے ہیں،

غالبؔ: کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے، اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر مبتدیوں کا سا ہے، مضمون بھی نیا نہیں، دیکھئے خواجہ حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے،

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب — کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

لیکن ان دونوں اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب "اردو غزل" (ص ۳۸۹) میں رقمطراز ہیں کہ غالب نے حافظ کے شعر میں تھوڑا سا تصرف ضرور کیا ہے، لیکن بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے، "زود پشیماں" کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے، اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے، کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے،

غالب: حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز — دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

شیدا:- گفتن دعا بزلف تو تحصیل حاصل است — باخضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

یگانہ لکھتے ہیں کہ ملا شیدا کے شعر سے مضمون اڑا کر کچھ کہنا چاہا تھا، مگر شعر تو گتھا نہیں گورکھ دھندا بن کر رہ گیا، لیکن غالب کے اسی شعر کے متعلق حالی کہتے ہیں، کہ ایک نئی شوخی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی، کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو، یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو، آسی نے فارسی کا مذکورۂ بالا شعر نعمت خاں عالی کا بتایا ہے، یگانہ اس کو شیدا کا بتاتے ہیں، میرے پیش نظر اس وقت نعمت خاں عالی اور شیدا دونوں میں سے کسی کا دیوان نہیں، جو یہ بتاتا کہ یہ کس کا شعر ہے، لیکن اگر شیدا کا شعر ہے، تو شیدا پر خود ہی سرقہ کا الزام رکھا گیا تھا، جس کو اس راقم نے اپنی تصنیف بزم تیموریہ میں جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس کو ہم یہاں بھی دہراتے ہیں، ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں جہانگیر اجمیر گیا، تو اس کے شاہی جلو میں شعراء بھی تھے، ایک روز شیخ فیروز کی قیامگاہ پر تمام اصحاب سخن مثلاً



طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری، وغیرہ جمع ہوئے، شیخ فیروز کو مقبولیت اس لئے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، یہ مجلس جاری تھی، کہ شیدا بھی آپہنچا، تمام شعرا نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا، اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی، شیدا نے یہ شعر پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے — حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے،

عشق را پیمبر ولیکن — حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا، لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا،

زبسکہ کرد غمت تند بر جگر ناخن — چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثا نی حلوانی کا چربہ ہے

از بسکہ بستہ کف قدم و ناخن در درشت — چو پشت ماہیت سراپائے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا، مگر ایک اور شعر پڑھ کر داد چاہی،

گر بہ صحرا موفشانی دشت پر سنبل شود — در بدریا رو بشوئی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولے کہ یہ تو ملا کاتبی کے شعر سے توارد ہے،

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ — خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ،

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد — از روئے ادب مہر خدا بر پشت

شیخ فیروز نے فوراً ہی ہاتفی کا شعر پیش کیا،

بنوت را توی آن نامہ درشت — کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہو کر بدکلامی شروع کر دی، بعض اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے، تو اُس نے یہ شعر پڑھا،

زلف را او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل

زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ شیدا کی دل آزاری مراد نہیں، لیکن اس مضمون کا شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے،

کس نیابد مصرعۂ پیچیدۂ زلف کجت — گرچہ ایں مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

اس طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا، بالآخر اس پر مہر سکوت لگ گئی، اور باوجود اصرار کے اُس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی، اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا، جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا (یہ تفصیل مخزن الغرائب قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۲۱۶ - ۲۱۵ سے لی گئی تھی)

اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ ایک اونچے درجہ کا غزل گو قصداً سرقہ نہیں کرتا، لیکن بعض اوقات اُس کے اشعار میں غیر شعوری طور پر یا تو کچھ خاص خاص الفاظ یا تراکیب یا مضامین ایسے آ جاتے ہیں، جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرقہ ہے، شیدا کو خود خبر نہ تھی کہ اس کے اشعار کے متحد المعنی اشعار پہلے سے موجود تھے، اور وہ اپنی استادی کے زعم میں اپنے اشعار سناتا، لیکن متوازی اشعار سنا کر اس کو زچ کر دیا جاتا، آثار الکرام کے مصنف نے صاحب تاریخ صبح صادق کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ شیدا نے ایک لاکھ اشعار کہے تھے، ظاہر ہے کہ ایک لاکھ اشعار کہنے والا سارق نہیں ہو سکتا، اسی طرح کسی غزل گو کے کلام کا تجزیہ



کیا جائے تو اس پر ویسے ہی سرقہ کا الزام آ سکتا ہو جیسا کہ یگانہ نے غالب پر رکھا ہے، حالانکہ غالب خود اعتراف رہا کہ وہ اساتذۂ فن سے استفادہ کرتے رہے ہیں،

یگانہ لکھتے ہیں کہ کوئی چوری کرتا ہے تو حرف بحرف نہیں کرتا، کچھ نہ کچھ الٹ پھیر کر کے پرائے مال کو اپنا بنا لینا چاہتا ہے۔ (غالب شکن ص ۳۷) لیکن غزل گوئی کے الفاظ اور موضوعات کچھ ایسے محدود ہیں کہ ان ہی کے الٹ پھیر میں غزل گو اپنے کمالات دکھاتا رہتا ہے، غزل گوئی کے خاص خاص الفاظ اور موضوعات حسن و عشق، ہجر و وصل، ناز و ادا، مہر و وفا، کرم و ستم، چشم و نرگس، گل و بلبل، شمع و پروانہ، لیلےٰ و مجنوں، شیریں فرہاد، وامق و عذرا، پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، قتل و خون، شیشہ و ساغر، مینا و سبو، پیمانہ و میخانہ، بت و خدا، زاہد و واعظ، محتسب و ناصح، جنون و گریباں، بہار و خزاں، خس و خار، آفتاب و ذرہ، دریا و قطرہ، دل و جگر، حسرت و ناکامی، نزع و مرگ، قبر و حشر، قفس و چمن، نظارۂ جمال، فرقت و وصال وغیرہ ہیں، ان ہی الفاظ کے سہارے غزلیں کہی جاتی ہیں، اور پھر اس سلسلہ میں عاشقوں کی شیفتگی، فریفتگی، بیخودی، مدہوشی، شوق و حسرت، اور رنج و غم کی منفعلہ کیفیتیں اتنی بار دہرائی جا چکی ہیں کہ غزل گویوں کے یہاں وہی ساری باتیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جائیں گی، پھر غزل گوئی کی خوبی بھی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں وہی تمام جذبات و احساسات پیش کئے جائیں جو عامۃ الورود ہوں یعنی عشق و محبت کی راہ میں عشاق کو جو پیش آتے رہتے ہوں اور جب یہ خوبی تسلیم کر لی جائے تو شعراء کے یہاں جذبات و احساسات کی یکسانیت کا پایا جانا نہ تعجب خیز ہے، اور نہ سرقہ ہے، اور اگر یہ سرقہ ہے تو بظاہر متحد المعنی ہیں اور قریب المعانی اشعار کا انبار لگا کر بہت سے اساتذہ کو سارق کہا جا سکتا ہے، مثلاً:

میرؔ: کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

آتشؔ: آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
یہ ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کیلئے

غالبؔ: زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

میرؔ: کاش کہ دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے، ایک کھوتے عشق میں

غالبؔ: میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

میرؔ: کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال
تم سے بھی اے بتاں خدا سمجھے

ذوقؔ: تم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

میرؔ: ناخن سے بوالہوس کا گلا یونہی چھل گیا
لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا

ذوقؔ: گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

میرؔ: احوال میرؔ جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر کر کر

راسخؔ: تمہاری بات اب راسخؔ سمجھ میں کس طرح آئے
گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور ڈرتے بھی جاتے ہو

میرؔ: میرے تغیر رنگ پہ مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

مومنؔ: میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میرؔ: بتوں کے جرم الفت پر مجھے زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

مومنؔ: تمہیں تقصیر اس بت کی کہ دو میری خطا لگتی
مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

میرؔ: سایہ میں اک بلند قامت کے
فتنے سب سو گئے قیامت کے

داغؔ: عشق میں اک بلند قامت کے
ہم گلے مل گئے قیامت کے

ناسخؔ: شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

غالبؔ: نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے



مصحفیؔ: شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ نا مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

غالبؔ: پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

آتشؔ: ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم
ناز ہی بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

غالبؔ: منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و وفا میرے بعد

غالبؔ: آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

ذوقؔ: یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

غالبؔ: نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ذوقؔ: وہ ہوں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جا ٹھہر
بہ رنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

غالبؔ: اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ذوقؔ: کیا اعتبارِ ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

غالبؔ: اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

ذوقؔ: اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

غالبؔ: پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ذوقؔ: کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

غالبؔ: نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ذوقؔ: نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر اک بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

غالبؔ: باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

ذوقؔ: سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
اژدہا بن کے شب ہجر رشکِ گلشن آتا ہے

غالبؔ: مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

ذوق: صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

غالب: دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگیہائے صبا کیا

شیفتہ: شمیم گل میں بوئے پیرہن ہے
غلط ہے یہ کہ احسان صبا کیا

غالب: عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

شیفتہ: عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی
میری ذلت تیری عزت ہی سہی

غالب: عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

شیفتہ: ازدحام غم و رشک حرماں
پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

غالب: خوب تھا ہوتے جو پہلے سے ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

مومن: مانگا کریں گے اب تو دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

غالب: عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مومن: دل قابل محبت جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

غالب: فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستی قاتل کے امتحاں کیلئے

مومن: بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کیلئے

غالب: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

مومن: ہے اعتماد میرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کیلئے

غالب: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مومن: جائیں دشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

غالب: صبر یہ جوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

داغ: موقوف وصل یار ہے گویا وصال پر
اک عمر چاہیئے کہ تمنا کرے کوئی



غالب: کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغ: جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدہ کو ہم
آتے ہوئے ادھر سے کئی بار سامنے

: میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
سب لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں

غالب: ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ظفر: کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصف بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب: سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ظفر: واہ اس صورت کدہ میں دیکھتے ہی دیکھتے
صورتیں کیا کیا نظر سے اپنے پنہاں ہو گئیں

غالب: وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

ظفر: جس سے چار آنکھیں تری اے آفت جاں ہو گئیں
تیر سی اس کے جگر کے پار مژگاں ہو گئیں

غالب: اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ظفر: یا تنگ ہے ذوق دشت نوردی کہ دو دن نکال
ہیں اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤں

میر: اللہ ری عندلیب کی آواز دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

ظفر: آجائے گر ہوائے گلستاں قفس تلک
بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہکر کہ ہائے گل

آتش: تبدیل شب وصل سے ہو روز جدائی
بالش کے عوض ہو سر دلبر کے تلے ہاتھ

ظفر: ہے جی میں تمنا یہ کہ سوتے ہیں تو گاہے
آجائے مرا عارض دلبر کے تلے ہاتھ

آتش: مستی میں طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا
کاٹوں گا میں کاٹے گا جو ساغر کے تلے ہاتھ

ظفر: دل ہاتھ میں اس کا لیا ہے یہ ظفر حال
جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ

آتش: پاؤں کو اُن کے چھوا میں نے تو ہنس کر بولے
کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ

ظفر: میں نے چوری سے جو شب زلف کو چھیڑا تو کہا
کاٹنے چاہیئے اس دزد سیہ کار کے ہاتھ

لیکن غزل کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چوری اور فرسودگی میں بھی ہر زمانہ میں تازگی و بودگی باقی رہتی ہے، اسی لئے غزل پڑھتے یا سنتے وقت یہ کم دیکھا جاتا ہے کہ غزل گو کیا کہہ رہا ہے؛ بلکہ زیادہ تر اس پر نظر رہتی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کس طرح کہہ رہا ہے، اور اسی کس طرح کہنے میں اس کی تازگی باقی رہتی ہے، اسی لئے دو شاعروں میں الفاظ یا کیفیات کے اشتراک کا ہو جانا کوئی سرقہ نہیں،

اس کے علاوہ اردو میں غزل گوئی شروع ہوئی تو تمام غزل گو شعرا نے ایرانی شعرا کے طرز میں غزلیں کہہ کر اردو غزل گوئی میں نکھار، بانکپن، رسیلا پن اور البیلا پن پیدا کرنے کی کوشش کی، اور میر سے لے کر غالب تک شاید ہی کوئی غزل گو شاعر ایسا گذرا ہے، جس کے یہاں فارسی شعرا کے کچھ نہ کچھ مضامین نہ آئے ہوں، دار المصنفین سے مولانا عبد السلام ندوی کی جو شعر الہند شائع ہوئی ہے، اس کی جلد اول میں ایسے بہت سے اشعار جمع کر دیئے گئے ہیں، (ص ۲۶ - ۴۲)

ان میں سے کچھ مثالیں ہم بھی یہاں ناظرین کی ضیافت کے لئے نقل کرتے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ غالب پر سرقہ کا الزام رکھنا کہاں تک درست ہے:

سودا: راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز
ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

حافظ: مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

سودا: کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیری: بوے یار من ازیں سست وفا می آید
ساغر از دست بگیرید من از کار شدم

میر: پایا نہ یوں کہ کہیے اس کی طرف اشارہ
یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

فغاں: مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند



نامعلوم: طالعِ شہرت رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشت من و او ہر دو ز یک بام افتاد

میر: بیشہ تو ایک ہی تھا اس کا ہمارا لیکن
مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی

میر: جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

نظیری: ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

قائم: فہرست میں خوبانِ وفادار کے پیارے
دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

نظیری: دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف
نامِ خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نامِ تو نیست

راسخ عظیم آبادی:-

قتلِ موعود کی حسرت میں موئے اہلِ نیاز
ہمنشیں سیر تو کر نازکی طغیانی کی

عرفی: طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

راسخ عظیم آبادی:-

قابلیت ہی نہ تھی کفر کے رتبے کی ہمیں
سبحہ کی لیک نہ شایستۂ زنار ہوئے

عرفی: درمیانِ کافراں ہم بودہ ام
یک کمر شایستۂ زنار نیست

سودا نے شاہجہانی دربار کے ملک الشعرا حاجی محمد جان قدسی کی ایک پوری غزل کا ترجمہ کر کے اپنی ایک غزل مشاعرہ میں پڑھی، عام شائقین کو تو پتہ نہ چل سکا لیکن جب اس کی نشاندہی سراج الدین علی خاں آرزو نے یہ شعر پڑھ کر کی،

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیئے فلک پہ ملک

تو سودا ان کی دیدہ وری سے خوش ہو کر اٹھے اور ان سے جا کر بے اختیار لپٹ گئے،

(شعر الہند جلد اول ص ۴۵)

نظیری کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:-

آمد سحر کہ دیر و حرم رفت و روکنند — تا با ز م از نعیب چو خوں در سبو کنند

خواجہ میر درد نے اسی زمین اور قافیہ میں غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے،

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

لیکن اُردو کے ان اساتذہ پر سرقہ کا الزام نہیں آتا ہے، وہ توار دو غزل کو فارسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اسی لئے اُن کے یہاں فارسی غزلوں کے خیالات، تراکیب اور محاورات کی بہتات ملے گی،

مرزا یگانہ کو بھی اعتراف ہے کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا، کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، متاخرین ہمیشہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں، (غالب شکن ص ۲۵) لیکن مرزا یگانہ غالب کو اس حق سے محروم اس لئے کر دینا چاہتے ہیں کہ اُن کا الزام الہامی اور تخیل کہا جاتا ہے، ان کا سارا غصہ اگر کلامِ غالب کو الہامی کہنے والوں پر اترتا تو صحیح تھا، لیکن غالب کو چور، گونگا، ٹھونس ٹھانس کرنے والا، بے سرا، بھونڈا، دہقانی، بے ڈھنگا، وغیرہ کہنا کہاں تک ادبی فرض اور خدمت انجام دینے کے مرادف ہے، اور پھر حسب ذیل عبارت لکھنا کہاں تک ادبی تہذیب میں داخل ہے،

"اک اُلو کا پٹھا مولوی ٹھینگا موہانی غالب کے اس دہقانی شعر پر بھی جو نہایت شرمناک چوری ہے، سر دھنتا تھا، آو میاں گم شدند"

(ص ۔ ۴۴)

اور پھر سرقہ کا جو معیار یگانہ نے قائم کیا ہے، اس لحاظ سے ان کا یہ کہنا کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا، خود سرقہ ہے، انھوں نے غلام علی آزاد بلگرامی کے اس فقرہ کو اپنانے کی کوشش کی ہے،



"واگر بنظر تفتیش ملاحظہ کنند کم شاعرے را از توارد مضامین خالی یابد"

(مآثر الکرام جلد دوم ص ۶۹)

آزاد بلگرامی توارد کے تو معترف ہیں لیکن ان کا قلم یگانہ کی طرح سرقہ کا الزام رکھنے میں بے باک اور بے کا دا نہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے توارد کی بڑی دلچسپ تفصیل لکھی ہے، جو بہت سے مقالہ نگاروں کے لئے شمعِ راہ بنی ہوئی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ فارسی کا مشہور شاعر مرزا محمد قلی سلیم طرشی (المتوفی ۱۰۵۷ھ) دوسروں کے مضامین لے کر خوب ادا کرتا، جیسا کہ خود کہتا ہے،

گفت حافظ دید چوں کلک بیانم را سلیم — بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت

لوگوں کی زبان پر یہ برابر ہوتا کہ سلیم "معانی بیگانہ" سے خوب آشنا ہو جاتا ہے، یعنی وہ دوسروں کے مضامین کو خوب اپناتا ہے،

وارستہ نے اُس کو مخاطب کر کے کہا تھا،

وطلے کہ نبردی بکلام اللہ است — بیتے کہ نبردہ تو بیت اللہ است

لیکن سلیم کو خود شکایت تھی کہ اس کے حریف اُس کے مضامین کے باغ کی غارتگری میں لگے رہتے ہیں،

دیوانِ خود بدستِ حریفاں مدہ سلیم — غافل مشو کہ غارتِ باغ تو می کنند

اور وہ خود یہی الزام اپنے معاصر شاعر صائب پر رکھتا ہے،

دیوان کیست از سخنانم تہی سلیم — تنہا نہ بر من ایں ستم از دستِ صائب است

صائب کی نادر الکلامی میں کس کو شک ہو سکتا ہے لیکن سلیم و صائب کے بہت سے متحد المضامین اشعار ہیں، مثلاً

سلیم: مشاطہ را جمال تو دیوانہ می کند
کائینہ را خیال پری خانہ می کند

صائب: دل را نگاہ گرم تو دیوانہ می کند
آئینہ را رخ تو پری خانہ می کند

سلیم: چشم تو ام ز ہوش تہیدست می کند
یک سرمہ دان شراب کجا مست می کند

صائب: از چشم نیم مست تو با یک جہاں شراب
با صلح کردہ ایم بہ یک سرمہ دان شراب

سلیم: صدا چگونہ برآید کہ ایں سیہ چشمان
بہ سنگ سرمہ شکستند شیشہ ما را

صائب: نماند نالہ دل در دیشہ ما را
بہ سنگ سرمہ شکستند شیشہ ما را

سلیم: ز آشفتگی طرہ مقصود خبردار
ہر فال کہ از شانہ شمش دگرفتیم

صائب: خواہد فتاد دامن زلفش بدست من
این فال را ز شانہ شمشاد دیدہ ام

سلیم: زینت ارباب معنی جوہر ذاتی بس است
لالہ در کوہ بدخشاں گر نباشد گو مباش

صائب: شمع بر خاک شہیداں گر نباشد گو مباش
لالہ در کوہ بدخشاں گر نباشد گو مباش

سلیم: اگر بہ چشم حقیقت نظر کنی دانی
کہ طوق فاختہ بر پای سرو خلخال است

صائب: حسن بالا دست را آراستن چوں عشق نیست
طوق قمری سرو را بہتر ز خلخال زر است

سلیم: سلیم ہند جگر خوار خورد خون مرا
چہ روز بود کہ راہم بایں خراب افتاد

صائب: صائب از ہند جگر خوار بروں می آیم
دستگیر من اگر شاہ نجف خواہد شد

ان اشعار کو نقل کر کے مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں، کہ حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں جو اشتراک مضامین پیدا ہو گیا ہے، ان کو توارد پر محمول کیا جائے، پھر وہ علامہ تفتازانی کی ایک رائے کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ سرقہ تو اس وقت ہے کہ جب یقینی طور پر ثابت ہو کہ ایک شعر پہلے سے کسی شاعر کے شعر سے اخذ کر لیا گیا ہے، اور اگر سرقہ ثابت نہیں ہے تو یہ توارد ہے، اور اگر کسی شعر کا اخذ کرنا معلوم نہ ہو تو پھر بھی کہنا چاہئے کہ فلاں شاعر نے ایسا کہا ہے، لیکن



دوسرے شاعر نے سبقت کر کے پھر ایسا کہدیا ہے، اس حسن تعبیر سے سچائی کی فضیلت باقی رہ جاتی جس کو غنیمت جاننا چاہیئے، اس طرح علم غیب کا دعوٰی بھی نہیں ہونے پاتا، اور کسی کا نقص بھی نہیں نکلتا، اسی سلسلہ میں آزاد بلگرامی نے ابوطالب کلیم کے حسب ذیل تین شعر نقل کئے ہیں:

منم کلیم بطور معنی بلند ہمت
کہ استفادہ معنی جز از خدا نہ کنم

بخوان فیض الٰہی چو دسترس دارم
نظر بکاسہ دریوزہ گدا نہ کنم

ولے علاج توارد نمی توانم کرد
مگر زباں بہ سخن گفتن آشنا نہ کنم

کلیم نے اپنی مہارت کے زعم میں کہا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور سے استفادہ نہیں کرتا، وہ فیض الٰہی کے خوان سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے، اس لئے اس کو دریوزہ گری کی ضرورت نہیں، اور اگر اس کے یہاں توارد پایا جاتا ہے، تو اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں، وہ شعر ہی نہ کہے، یہی بات غالب بھی کہہ گئے ہیں،

مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ توارد ناگزیر ہے، جس کی بہت سی مثالیں انھوں نے مآثر الکرام جلد دوم میں دی ہیں، ان میں سے ہم بھی یہاں پر کچھ نقل کرتے ہیں،

امیر خسرو: بستم دل اسیراں بکجا گریز از تو
بحوالی دو چشمت چشم بلا نشستہ

صائب: بحوالی دو چشمت چشم بلا نشستہ
چوں قبلہ کرد لیلیٰ ہمہ جا بجا نشستہ

بنائی: قضا کہ بر لب و خط عنبریں دارد
برائے کشتن من زہر در نگیں دارد

صائب: امید جان شیریں داشتم از لعل سیرابش
ندانستم کہ از خط زہر در زیر نگیں دارد

صائب غزل طرازوں کے امام اور سخن پردازوں میں علامۂ وقت، نوائے فصاحت کے حامل اور اعلائے کلمۂ بلاغت کے نشان سمجھے جاتے تھے، ان کو اپنی معنی آفرینی پر ناز تھا، خود بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں،

زصد ہزار سخنور کہ درجہان آید — یکے چو صائب شوریدہ حال برخیزد

غزل گوئی بہ صائب ختم شد از نکتہ پردازاں — رباعی گر مسلم شد ز موزونان سحابی را

غزل بنود بایں رتبہ ہیچ گہ صائب — نوائے عشق درایام من کمال گرفت

ایسے شاعر کے متعلق کوئی یہ کہے کہ اُس نے امیر خسرو اور بنانی سے سرقہ کیا تو یہ بڑی بے ادبی، اور ادبی بے خبری کی دلیل ہوگی۔ صائب کے اشعار کے مضامین بعد کے شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً عالمگیری دور کے شاعر خان مرزا معز الدین موسوی فطرت، ناصر علی سرہندی (المتوفی ١١٠ھ) اور اُن کے بعد کے مرزا عبدالقادر بیدل (المتوفی ١١٣٣ھ) کے بعض اشعار میں تقریباً وہی مضامین ہیں، جو صائب کے یہاں ہیں۔

صائب: سر چشمۂ حیات لب میچکان اوست — عمر دوبارہ سایۂ سرو روان اوست

فطرت: عیش ابد بکام دل ہر دو مند تست — عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست

صائب: صحبت ناجنس آتش را بفریاد آورد — آب چوں در روغن افتد می کند جیحون چراغ

ناصر علی: آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ — صحبت ناجنس را باشد ثمر آزارہا

صائب: ہمیشہ صاحب طول امل غمیں باشد — کہ چین بقدر بلندی در آستیں باشد

بیدل: دستگاہت ہر قدر بیش است کلفت بیشتر — درخور طول است چینہائے کہ در آستین

تذکرہ نگار ناصر علی سرہندی کو شیر نیستان سخنوری اور مرد میدان معنی گستری بتاتے ہیں، مرزا عبدالقادر بیدل اپنی سحر پردازی اور معنی آفرینی میں اب تک بے نظیر سمجھے جاتے ہیں، ان اساتذۂ سخن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا سکتا ہے کہ انھوں نے صائب کے اشعار سے سرقہ کیا، اور پھر بیدل اور میرزا محمد طاہر قزوینی وحید کے ایک شعر کا دوسرا مصرع تو بالکل ایک ہی ہے،



وحید: بال مرا شکستگی پر نبستہ است — پرواز ما چو رنگ ببال شکستہ است

بیدل: بالاف ہمت از پر و عجز می زنیم — پرواز ما چو رنگ ببال شکستہ است

خود وحید کے بعض اشعار کے مضامین اُن کے پہلے کے شعراء سے مشابہ ہیں،

واعظ: مدعا از دل بروں کن تا بر آید مدعا — شد نگیں با نام تا افگند از خود نام را

وحید: دور فگن نام را کہ نام فگندن — صاحب نام و نشاں نمود نگیں را

ناظم: چناں بگذشت زیں نہ سقف شفاف — کہ سیلاب نگہ از عینک صاف

وحید: ز چشم مہ سوئے بالا سفر کرد — چو نور دیدہ از عینک گزر کرد

بانی: بباغ بسکہ ز شرم رخت گل آب شود — غلاف غنچۂ گل شیشۂ گلاب شود

وحید: بہ گلشنے کہ رخ دوست بے نقاب شود — ز شرم غنچۂ گل شیشۂ گلاب شود

میرزا محمد رفیع واعظ قزوینی نے اپنی کتاب ابواب الجنان کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی، ملا عبدالرزاق فیاض ایران کے مشہور فلسفی اور حکیم ملا صدرا شیرازی کے لائق شاگرد ہیں، میرزا محمد طاہر وحید قزوینی شاہ عباس ثانی صفوی کے دور کا شاعر ہے، اس نے دو مثنویاں مخزن اسرار اور ناز و نیاز لکھیں، اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار ہیں، ظاہر ہے کہ تیس ہزار اشعار کہنے والا شاعر سرقہ نہیں کر سکتا، پھر واعظ کے ایک شعر کا مضمون میرزا محمد قلی سلیم طہرانی سے ملتا جلتا ہے،

سلیم: اگر از صبح محشر روزن من روشنی یابد — کہ شبہائے سیاہم ابر و پیوستہ را ماند

واعظ: چوں دو ابروے سیاہت کہ بہم پیوستہ است — بے تو شبہائے درازم ہمہ برہم بستہ است

شاہجہانی دربار کے ملک الشعراء ابو طالب کلیم کا کلام اس کے عہد میں شعلۂ طور بن کر چمکا لیکن اس کے بعض اشعار کے مضامین بھی سلیم کے اشعار سے مشابہ ہیں، مثلاً

سلیم: شوقِ رویش ہر کس را بہ غریبی دارد — سبب این است جلائے وطن آئینہ را

کلیم: چند در خانہ اش آتش فتد از پرتو تو — زین ستم آئینہ در فکر جلائے وطن است

سلیم: چون کشم بارِ گرانِ غم دوری کز ضعف — نگہ خود نتوانم ز رخت بردارم

کلیم: زنا توانی خود این قدر خبر دارم — کہ از رخت نتوانم کہ دیدہ بردارم

اور دوسرے اساتذہ کے متحد المضامین اشعار یہ ہیں،

میر خسرو: دمِ واپسیں زلیخا بہ ہمیں ترانہ تن زد — کہ بہ جذبۂ محبت پسر از پدر گرفتم

نفی۔ چہ غم از فریبِ دشمن کہ محبتِ زلیخا — بکشاکشِ نہانی پسر از پدر برآرد

اسیر: نیست جوہر بہ تیغ یار اسیر — بہر قتلم نوشتہ دارد

صدری۔ نیست جوہر کہ بشمشیر تو تصویر شدہ است — رقمِ قتلِ جہانے است کہ تحریر شدہ است

عرفی۔ قضا جدا ز تو خونم چرا نمی ریزد — مگر ز دستِ قضا این قدر نمی آید

اسیر: یار ہرگز ببر نمی آید — از قضا این قدر نمی آید

حزنی: مرا بر سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید — کہ دارد چشمِ لطف از دلبر نامہربان من

فطرت: مرا بر سادہ لوحیہائے فطرت خندہ می آید — کہ عاشق گشتہ و چشمِ وفا از یار ہم دارد

سلیم: آنکہ پیغامِ پرواز بالبوئے او دل — نامہ بے طاقتان بربالِ مرغِ بسمل است

فطرت: می تواں از دلِ تپیدن یافت احوالِ مرا — نامۂ بے طاقتاں بربالِ مرغِ بسمل است

دانش: لب تشنۂ تیغم بگو قاتلِ ما را — کو آب کہ شیرینی جان زد و دلِ ما را

قاسم دیوانہ: دمِ آبے ز تیغت مستمندم — دلم می سوزد از شیرینی جان

پیشرو اساتذہ سے استفادہ کرنا غزل گوئی کی روایت بن گئی ہے، خواجہ حافظ شیرازی کی غزل گوئی پر تو کوئی حرف نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن مولانا شبلیؒ رقمطراز ہیں کہ خواجہ صاحب



نے غزل گوئی شروع کی، تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

دارد سخنِ حافظ طرز و روشِ خواجو

پھر حافظ کی جو غزلیں خواجو کی غزلوں کی ہم طرح ہیں، ان میں جا بجا مصرعے یک رنگ ہیں، اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، اسی طرح سلمان کی غزلوں پر بھی حافظ کی اکثر غزلیں، اور ان سے بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنا پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے۔

خواجو اور سلمان کے جو متحد المضامین اشعار حافظ کے یہاں ملتے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:-

خواجو: گر شدیم از بادہ بدنام جہان تدبیر چیست — ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

حافظ: در خراباتِ مغاں ما نیز ہم دستاں شدیم — کایں چنیں رفت است در روزِ ازل تقدیر ما

خواجو: ما دل دیوانہ در زنجیرِ زلفت بستہ ایم — اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما

حافظ: عقل اگر داند کہ دل در بندِ زلفش چون خوش است — عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیرِ ما

خواجو: از خدنگِ آہ عالم سوز ما غافل مشو — کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیرِ ما

حافظ: تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش — رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیرِ ما

خواجو: بیا صبا خبرے کن مرا از اں کہ تو دانی — بداں زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی

حافظ: نسیمِ صبحِ سعادت بر آں نشان کہ تو دانی — گذر بکوی فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی

خواجو: چو مرغ در طیراں آئی و چون بادِ چرسی — نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی

حافظ: تو پیک حضرت شاہی مراد و دیدۂ بدر است — کرم نما و بفرما خبر جاناں کہ تو دانی

خواجو: دل دریں پیرزن عشوہ گر دہر مبند — کیں عروسے است کہ در عقد بسے داماد است

حافظ: مجو درستی عہد از جہان بے بنیاد — کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

خواجو: منزل از پا ترین است چہ دوزخ چہ بہشت — سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت

حافظ: ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست — ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو: کے برکنم دل از رخ جاناں کہ چہ راد — با شیر در دل آمد و با جان بدر شود

حافظ: عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم — با شیر در بدن شد و با جان بدر شود

سلمان: سودائے زہد خشکم بر باد دادہ حاصل — مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ

حافظ: گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشینند — بے بانگ رود و چنگ و بے یار و جام بادہ

سلمان: ایم بستہ دل را در لعل دلکشایت — آن لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ

حافظ: زیں زہد و پارسائی بگرفت خاطر من — ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ

سلمان: سودائیان زلفت گرد تو حلقہ بستہ — شوریدگان مویت در کمند گرفتادہ

حافظ: در مجلس صبوحی دانی چہ خوش نمائد — عکس عذار ساقی بر جام می فتادہ

مولانا شبلی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ ”خواجہ صاحب نے متحد مضامین شیخ سعدی سے بھی لئے ہیں“، اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ حافظ نے اپنی بعض غزلیں خسرو کی غزلوں کو سامنے رکھکر کہی ہیں ہم نے اپنی کتاب بزم مملوکیہ میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں (ص ۲۱۰) ان میں سے ایک مثال یہاں بھی پیش کی جاتی ہے

خسرو: بیا جاناں کہ جانت را بمیرم، — دگر صبرم بجاں منت پذیرم

حافظ: بہ تیغم گر زنند دستش نگیرم، — دگر تیرم زنند منت پذیرم

خسرو: نظر گفتند داری با فقیراں — من مسکین نہ آخر ہم فقیرم



زکاتم دہ کہ مسکین و فقیرم

حافظ: نقاب حسن در حد کمال ست

نمی آید بگوشت نالۂ من — کہ گوش چرخ کر گشت از نفیرم

خسرو: — رسد تا سدرہ آواز نفیرم

حافظ: من آں مرغم کہ ہر شام و سحرگاہ

مذکورہ بالا اشعار میں کہیں مضامین کہیں قوافی اور کہیں ترکیبیں مشترک ضرور ہیں لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان مضامین اور الفاظ کے الٹ پھیر میں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں تو خواجہ حافظ اپنے پیشرو سے بازی نہیں لیجا سکے ہیں، لیکن خواجہ حافظ نے اکثر اشعار میں اپنی برجستگی، لطافت اور حسن بندش کی وجہ سے اپنے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ بقول مولانا شبلی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی ان ہی قطروں سے بنے ہوئے ہیں، مولانا شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ خواجہ حافظ نے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، ان کی شاعری کے بہات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ جام کے ابر کرم کے رشحات ہیں، بایں ہمہ ان کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں اس کا کچھ سبب ہوگا اور وہ ہی خواجہ حافظ کی خصوصیات شاعری ہیں ...... حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے، لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق ہے، (شعر العجم حصہ دوم ص ۲۴۵ - ۲۳۹) اور بالکل یہی بات غالب کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے،

شاید مرزا یگانہ کی نظر مذکورہ بالا اساتذہ کے متحد المضامین اشعار پر نہیں پڑی، ورنہ وہ غالب شکن کی طرح حافظ شکن، صائب شکن، کلیم شکن، اور بیدل شکن وغیرہ بھی لکھ ڈالتے، اور ان میں

ہر ایک کو اُلو، بُدھو، نٹھو، چچا چور، ڈھیڈ س، گونگا شاعر، ٹھونس ٹھانس کرنے والا، اور بے سرا ثابت کر کے مزید ادبی خدمت انجام دیدیتے،

یگانہ کے "غالب شکن" پر اظہارِ خیال کرنے میں میری یہ تحریر ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے جس کے لئے ناظرین سے معذرت خواہ ہوں، خیال تھا کہ یگانہ کے ہفوات ہفوات ہی سمجھے جائیں گے لیکن اُن کے خیال کی تائید اس مضمون میں بھی کی گئی، جو ارگس کے فرضی نام سے ۱۹۲۰ء کے رسالہ نگار میں کئی قسطوں میں شائع ہوا، پھر اس قسم کی آواز بازگشت ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر عندلیب شاوانی کے ایک مضمون میں بھی سُنائی دی، جس کو انھوں نے اپنی کتاب تحقیقات کی روشنی میں بھی منسلک کیا، پھر نیاز فتحپوری نے ۱۹۶۲ء میں نگار کا جو غالب نمبر شائع کیا، اس میں بھی یہ آواز دھیمے انداز میں سننے میں آئی، اسی طرح دہلی کے رسالہ تحریک کے غالب نمبر (مارچ ۱۹۶۹) کے ایک مضمون "غالب مجتہد یا مقلد" میں یگانہ کی تصنیف غالب شکن کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، اسی لئے یہ خیال ہوا کہ غالب شکنی کے ان حملوں کا دفاع اچھی طرح کیا جائے، اسی لئے اس عنوان کے تحت میری تحریر طویل ہو گئی،

**نوٹ** :- اس مضمون کی پہلی قسط میں معارف کے ص ۲۶۵ پر رشید رضا چھپ گیا ہے، رضا نامہ ہے، ناظرین اس کی تصحیح کر لیں، یہ پورا مضمون میری کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کا ایک باب ہے، یہ کتاب انشاء اللہ جلد شائع ہو گی،

......٭......



# بانی درسِ نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از

جناب مفتی محمد رضا انصاری استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۵)

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (شمس العلماء) جن کی وفات ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں ہوئی، احوالِ رجال میں بڑے محقق گذرے ہیں، اپنے جد امجد مُلا نظام الدین محمد فرنگی محلی (وفات ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) کے سوانح اُن کے تلامذہ کے حالات اور تلامذہ کے سلسلۂ درس کی تفصیل اصلی ماخذوں بلکہ ایسے لوگوں سے جو براہ راست واقفیت رکھتے تھے قلم بند کرا کے اکٹھا کئے گئے تھے، فرنگی محل کے سن رسیدہ حضرات میں انھیں ایسے لوگ تو بے شک نہیں ملے، جنھوں نے مُلا صاحب کا زمانہ پایا ہو، لیکن مُلا صاحب کے تلامذہ اور اُن کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والے اس وقت موجود تھے، جب مولانا محمد نعیم نے مُلا صاحب کے احوال کی تدوین کی طرف توجہ کی تھی، اس سلسلے میں اُن کی تحقیقات خالص مورخانہ انداز کی اور بے کم و کاست ہیں، ان ہی مورخانہ تحقیقات میں اُن کا یہ انکشاف بھی ہے، کہ علامہ تفضل حسین خاں (وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے اتالیق پھر نائب المملکت) دراصل مُلا محمد حسن ابن مُلا محمد رضا فرنگی محلی (شاگرد رشید مُلا نظام الدین فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، عام طور پر یہی ملتا ہے، کہ علامہ تفضل حسین کو مُلا حسن فرنگی محلی سے تلمذ تھا، بے شک مُلا حسن سے بھی تلمذ تھا، اور چونکہ مُلا حسن بحیثیت مصنف کافی مشہور ہوئے، اور مُلا احمد حسین بن مُلا محمد رضا فرنگی محلی "وہ" کم ...

بے تعینی" کے شہرۂ آفاق نہ ہو سکے، اس لئے تذکرہ نگاروں نے علامہ تفضل حسین خاں کے اساتذہ میں ملا احمد حسین فرنگی محلی کا ذکر ضروری نہیں سمجھا،

**غفران مآب** علامہ تفضل حسین خاں کے ذکر کے ساتھ ہی، جو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے بہ یک واسطہ شاگرد تھے، مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جن کو دو واسطوں سے ملا نظام الدین سے تلمذ تھا، مولانا سید دلدار علی جو غفران مآب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، اور جن کا خاندان "خاندان اجتہاد" کہلاتا ہے، مولانا حیدر علی سندیلوی کے شاگرد تھے، جو اپنے والد ملا احمد اللہ سندیلوی کے بھی شاگرد تھے، اور ملا باب اللہ جون پوری سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں، جیسا کہ نزہتہ الخواطر کا بیان ہے، مولانا حیدر علی سندیلوی کو بھی ملا باب اللہ جونپوری سے تلمذ تھا، اور اپنے والد سے (ملا احمد اللہ سندیلوی سے) انھوں نے پڑھا تھا، ملا احمد اللہ سندیلوی کو ملا حمد اللہ سندیلوی سے تلمذ تھا، اور ملا حمد اللہ ملا کمال الدین سہالوی (شاگرد خاص ملا نظام الدین سہالوی) کے شاگرد تھے، جیسا کہ اغصان الانساب (قلمی) کا بیان ہے، اور ملا احمد اللہ سندیلوی نے ملا نظام الدین سے پڑھا بھی تھا، اور تکمیل بھی ان ہی سے کی، یعنی فاتحۃ الفراغ ملا نظام الدین ہی سے پڑھا، آہذ نامہ مصنفہ مولانا غلام امام خیرآبادی کا بیان ہے کہ ملا باب اللہ جون پوری، ملا احمد اللہ سندیلوی کے شاگرد تھے جن کو ملا نظام الدین اور ملا کمال الدین سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور مولانا سید دلدار علی نصیرآبادی کے فرزند مولانا سید محمد مجتہد نے بھی مولانا حیدر علی سندیلوی سے پڑھا تھا، اس طرح خاندان اجتہاد کو جو اصلاً ضلع رائے بریلی کا ہے، لیکن اس کے بیشتر افراد خاص کر علماء مجتہدین تقریباً دو سو سال سے لکھنو میں بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں، دو دو واسطوں یا تین واسطوں سے ملا نظام الدین فرنگی محلی سے تلمذ حاصل ہے، غفران مآب نے ان کے بعد ان کے خاندان نے



درس و تدریس کو ہمیشہ اپنا اصلی شغل رکھا، اس طرح ملا نظام الدین فرنگی محلی کے سلسلۂ تلمذ کا دائرہ اس خاندان کے واسطے سے وسیع تر ہوتا چلا گیا،

غفران مآب پہلے شخص ہیں جنھوں نے لکھنو میں آصف الدولہ وزیرالممالک اور ان کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی تحریک پر ۱۲۰۱ھ میں شیعہ نماز جماعت قائم کی، اور پہلے امام مقرر ہوئے، اس سے قبل شیعہ حضرات بلاجماعت فرادی نماز پڑھتے تھے، اس سلسلے میں نزہتہ الخواطر کے مؤلف کا بیان ہے کہ شیعوں کی نماز باجماعت شروع کرنے کا مشورہ خواجہ سید علی اکبر مودودی فیض آبادی نے سرفراز الدولہ کو دیا تھا، خواجہ سید علی اکبر مودودی سلسلۂ چشتیہ کے شیخ طریقت تھے، سرفراز الدولہ حسن رضا خان اور ان کے آقا آصف الدولہ دونوں خواجہ مودودی کا بڑا ادب و لحاظ کرتے تھے،

یکرمه نواب آصف الدوله ووزیره حسن رضا خان و یتردوا الیه و تتلقی اشاراته بالقبول وهو الذی اشار الی الوزیران یقیموا الجماعة للصلوٰة (ص ۳۲۹ جلد ۷)

نواب آصف الدولہ اور اُن کے وزیر حسن رضا خان خواجہ علی اکبر مودودی کا بڑا ادب کرتے تھے، ان کی خدمت میں حاضری بھی دیتے تھے، اور اُن کے ارشادات کی تعمیل کرتے تھے، اُن ہی خواجہ صاحب نے (شیعوں کی) نماز باجماعت کے سلسلے میں مشورہ دیا تھا،

ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تلامذہ اور بالواسطہ شاگردوں کی طویل فہرست کا احاطہ بلاشبہ ناممکن ہے، لیکن ملا صاحب کے درس کی مقبولیت اور اس کی طرف عام رجحان کا اندازہ کرنے

کے لئے تلامذہ اور تلامذہ کے شاگردوں کی کچھ نہ کچھ تفصیل ضرور مددگار ہو سکتی ہے، اس لئے دائرے کو محدود کرتے ہوئے ملا صاحب کے ان اجلۂ تلامذہ کا ذکر کافی ہوگا، جو خاندان فرنگی محل سے تھے، جن میں ملا کمال الدین سہالوی بھی شامل ہیں، جو اگرچہ فرنگی محلی نہ تھے، مگر ملا نظام الدین فرنگی محلی کے بنی عم اور ہم جد تھے،

ملا کمال الدین (وفات ۱۱۷۵ھ) کا ذکر قدرے تفصیل سے اس لئے بھی کیا گیا کہ تذکروں میں عام طور پر ان کے تلامذہ کے ذکر کے ساتھ استاذ سے شرف تلمذ کا حوالہ مل جاتا ہے، اور حق بھی یہ ہے کہ ملا نظام الدین کی وفات کے بعد ان کے درس کا اصلی ذمہ ملا کمال الدین ہی نے اپنے سر لے لیا تھا، اور پوری تن دہی سے اپنے استاد کی خالی جگہ کو پُر کرنے کی کوشش کرتے رہے، ملا کمال ہی کے زیر تربیت رہ کر ان کے استاذ زادے ملا عبد العلی اس درجہ کو پہونچے کہ بحر العلوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اور ان ہی ملا کمال نے اپنے بھانجوں ملا حسن فرنگی محلی اور ملا محمد علی فرنگی محلی کو استاد بلکہ استاذ الاساتذہ بنایا، اگرچہ ان کے یہ دونوں بھانجے اپنے جد (جد کے حقیقی بھائی) ملا نظام الدین سے علوم حاصل کر چکے تھے، مگر تکمیل نہیں کر پائے تھے،

ملا کمال الدین سہالوی (ثم فتح پوری) کی مسند درس فتح پور میں تھی، اور وہیں سے بیٹھ کر وہ اس خلا کو پُر کر رہے تھے، جو ان کے اموں استاد کی وفات سے فرنگی محل میں پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ فرنگی محل میں بھی ملا صاحب فرنگی محلی کے بلاواسطہ شاگردوں کے درس کی کئی مسندیں بھی ہوئی تھیں، جیسے ملا احمد عبد الحق فرنگی محلی (وفات ۱۱۸۷ھ) ملا احمد حسین فرنگی محلی (وفات تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں) اور ملا محمد یعقوب فرنگی محلی وغیرہ ان سب کے یہاں بھی طلبہ خاصی تعداد میں آتے تھے، جن میں سے بعض خاصے نامور بھی ہوئے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "جائے استاد خالی است" کا احساس فرنگی محل کی فضا میں پوری طرح موجود تھا، اور جب



ملا کمال الدین سہالوی کی نگاہ تربیت سے سنور کر ملا عبد العلی (بحر العلوم) ملا حسن اور ملا ولی درس و تدریس کی طرف آئے تو فرنگی محل میں پھر استاذ الہند ملا نظام الدین کا دور تازہ ہوگیا، اور سب سے زیادہ شہرت ملا عبد العلی بن ملا نظام الدین کو حاصل ہوئی، مگر وہ دس برس سے زیادہ فرنگی محل میں ٹھہر نہ سکے، اور خونریز شیعہ سنی قضیہ کے نتیجہ میں انھیں ترک وطن کرنا پڑا، شاہجہاں پور گئے، جہاں کم و بیش بیس برس درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا، حافظ رحمت خاں والی ملک روہیل کھنڈ کی شہادت کے بعد رام پور اس کے بعد بوہار (ضلع بردوان) گئے، ان دونوں مقامات پر ان کے قیام کی مجموعی مدت دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ۱۲۰۵ھ میں بحر العلوم مدراس پہونچ چکے تھے، جہاں بیس برس تک نشر علوم و عرفان کرنے کے بعد ۱۲۲۵ھ میں ان کا وصال ہوگیا،

**ملا حسن فرنگی محلی** بحر العلوم کے ترک وطن کے بعد فرنگی محل میں ملا حسن کی محفل درس استاذ الہند کی یادگار رہ گئی، اور ان کے بھائی ملا محمد ولی فرنگی محلی اور چچا ملا احمد حسین فرنگی محلی کی درس گاہ بھی، جو اس فرنگی محل میں تھی، طالبانِ علم کے لئے کشش رکھتی تھی، لیکن ملا حسن فرنگی محلی، ملا علاء الدین علی فرنگی محلی کے بیان کے مطابق:-

| | |
|---|---|
| بعد مہاجرت مولانائے کامل سوائے | مولانائے کامل (ملا عبد العلی بحر العلوم) |
| ملا حسن دیگرے نہ بود کہ ریاست | کے ترک وطن فرمانے کے بعد سوائے |
| علمی اختیار کند، ایشاں اختیار | ملا حسن کے فرنگی محل میں کوئی دوسرا |
| کردند و مرجع خدام و معتقدین ایں | نہ تھا جو علمی سرداری اختیار کرتا، |
| خاندان شدند، | انھوں نے علمی سرداری قبول کی، |
| | اور خاندان فرنگی محل کے معتقدین |

اور خدام کے مرجع بن گئے،

ملا عبدالاعلیٰ اس کے آگے لکھتے ہیں :-

قریب بست سال بدرس مشغول ماندند، وبسیار اعتبار پیدا کردند، چنانچہ مردمان ایشاں را جانشین مولانا عارف می دانستند دستخطا بر استفتار می کنانیدند، چنانچہ از مولانا عارف می کنانیدند، و بعد انتقالش از مولانائے کامل می کنانیدند؛

(رسالہ قطبیہ (قلمی))

بیس سال کے قریب ملا حسن فرنگی محل میں درس دیتے رہے، اور بڑا احترام ان کا کیا جانے لگا، چنانچہ لوگ ان کو مولانائے عارف (استاذ الہند ملا نظام الدین) کا جانشین سمجھنے لگے تھے، اور استفتوں پر ان سے ہی جواب لکھواتے تھے، جیسا کہ ملا نظام الدین سے لکھواتے تھے، اور ملا نظام الدین کے انتقال کے بعد مولانائے کامل (ملا عبدالعلی بحرالعلوم) سے لکھوایا کرتے تھے۔

پھر ملا حسن کو بھی اسی طرح کے شیعہ سُنّی قضیہ سے سابقہ پڑا، جیسا کہ بحرالعلوم کو پڑا تھا، یہ شجاع الدولہ وزیر الممالک کا زمانہ تھا، جس کی راجدھانی فیض آباد تھی، علمائے فرنگی کے ساتھ ملا حسن ایک وفد لیکر شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد گئے، کہ لکھنؤ کے حکام شیعہ سُنّی قضیہ بھڑکاتے، اور خون ریزی کراتے ہیں، اس وفد نے خیر اللہ حسینی اور محمد عطا حسینی کے خون ناحق کی بھی فریاد کی تھی، یہ دونوں طلبہ شیعہ سُنّی قضیے میں شہید ہوگئے تھے، مگر فیض آباد میں کوئی دادرسی شجاع الدولہ کے عمال نے نہیں کی، ملا عبدالاعلیٰ اس سلسلے میں ارکانِ وفد کی باہمی نااتفاقی کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں،



اس میں ناکامی کے بعد ملا حسن بھی لکھنؤ واپس آنے کے بجائے فیض آباد سے اس راہ پر چل پڑے جو اس سے قبل ان ہی حالات میں بحرالعلوم نے اختیار کی تھی، اور حافظ رحمت خاں کے پاس شاہجہاں پور پہنچ گئے، اور شاہ مدن (شاہ شرف الدین قادری جیلانی شاگرد ملا کمال الدین سہالوی) کے یہاں قیام کیا، اس وقت بحرالعلوم بھی وہاں موجود تھے،

چوں حافظ رحمت خاں متوجہ بر جہاد مرہٹہ بود و آنہا غلبہ بسیار کردہ بودند خدمت ملا کردن نتوانست ضابطہ خاں ابن نجیب الدولہ ملا را بملک خود طلب نمود و آنجا تشریف بردند، اعزاز کلی نمود، چوں خان مذکور از کفار ہزیمت خورد برفاقت شاہ عالم ماندند چوں خانِ مذکور بر ملک خود قائم شد باز ملا را طلبیدہ باعزاز تمام در ملک خود داشت چوں دراں ملک ہمیشہ ہنگامہ کفار و بغاوت بود برخاستہ در مصطفیٰ آباد تشریف آوردند چند سال درس دادہ فوت کردند،

اس وقت چونکہ حافظ رحمت خاں مرہٹوں سے لڑائی کی تیاری میں مصروف تھے، جو بے پناہ یورش کر رہے تھے، اس لئے ملا حسن کی خدمت بجا نہ لاسکے، نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں نے ملا حسن کو اپنے یہاں دارانگر (نزد امروہہ ونجیب آباد) بلالیا، اور تشریف آوری پر بڑی توقیر کی، اور جب ضابطہ خاں کو مرہٹوں کے مقابلہ میں ہزیمت ہوگئی (اور ریاست ہاتھ سے نکل گئی) تو ملا حسن شاہ عالم (بادشاہ دہلی) کی رفاقت میں شاہجہاں آباد میں رہنے لگے، جب ضابطہ خاں پھر اپنی مملکت پر قابض ہوا تو اس نے ملا حسن کو دہلی

سے بلوالیا، اور پورے اعزاز و احترام
کے ساتھ اپنے ساتھ رکھا، لیکن چونکہ
اس کی مملکت میں مرہٹوں اور فسادیوں
کی طرف سے ہمیشہ گڑبڑ سی رہتی تھی،
اس لئے ملا حسن وہاں سے رامپور آگئے
اور چند سال درس و تدریس میں گذار
کر وفات پاگئے، (رسالہ قطبیہ قلمی)

ملا حسن کی وفات رامپور ہی میں ہوئی، اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی، خاندانی تحریروں میں ملا حسن کی وفات کا سال مذکور نہیں ہے، قدرت اللہ شوق رامپوری نے جو تذکرۂ شعراء موسوم بہ طبقات الشعراء کے مصنف ہیں، اپنی دوسری تصنیف "تاریخ جام جہاں نما" (قلمی) میں جو رضا لائبریری (رامپور) میں محفوظ ہے، ملا حسن کی وفات کا سال ۱۱۹۹ھ لکھا ہے، قدرت اللہ شوق ملا حسن فرنگی محلی کے "ہم استاد" مولوی غلام طیب بہاری کے شاگرد تھے، ملا حسن اور مولوی بہاری دونوں نے مطولات ملا کمال الدین سہالوی سے پڑھی تھیں،

رسالہ قطبیہ کے مصنف ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی ملا حسن کے داماد تھے، ان کا بیان ملا حسن کے سلسلے میں بلاشبہ مستند ترین بیان ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارانگر (واقع ضلع بجنور) کے مدرسے میں ملا حسن نجیب الدولہ کے زمانے میں نہیں گئے تھے (جن کا انتقال ۱۱۸۴ھ میں ہوا) بلکہ ان کے بعد اُن کے بیٹے ضابطہ خاں کی دعوت پر گئے، یہ وہ زمانہ تھا، جب .... حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ بقید حیات تھے، حافظ رحمت خاں کی شہادت ۱۱۸۸ھ میں ہوئی، اس طرح ملا حسن کے فرنگی محل سے جانے کا زمانہ قریب قریب متعین ہو جاتا ہے، اور وہ ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا ہے،



رسالہ قطبیہ کی تفصیل سے شیخ رضی الدین محمود انصاری (اغصان الانساب کے مصنف) کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ نجیب الدولہ نے ملا حسن کو اپنے مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے مامور کیا تھا،

ملا حسن کے فرنگی محل سے چلے جانے کے بعد ملا نظام الدین کی مسند درس ایک بار پھر سونی سونی نظر آنے لگی تھی، اگرچہ اس وقت بھی فرنگی محل میں تلامذہ ملا نظام الدین کی درسگاہیں تھیں، ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا جو شروع سے آخر تک اپنے ماموں چچا ملا نظام الدین سے پڑھ چکے تھے، اور جن کو رسالہ قطبیہ کے مصنف کے بیان کے مطابق ملا نظام الدین نے متبنیٰ بھی کیا تھا، اور جو مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کے بیان کے مطابق آخر عمر تک درس دیتے رہے تھے، ان ہی کے ایک شاگرد علامہ تفضل حسین گذرے ہیں، ملا نظام الدین کے ایک دوسرے شاگرد ملا محمد یعقوب بن ملا عبد العزیز بھی فرنگی محل ہی میں درس دے رہے تھے، بلکہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کی تصریح کے مطابق مولانا محمد یعقوب نے:-

"تحصیل علوم حضرت استاذ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ملا حسن سے کر کے فارغ التحصیل ہوئے...... استاذ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں آپ (ملا محمد یعقوب) کی تدریس کی شہرت ہو گئی تھی، آپ کی دیانت اور تقویٰ پر عوام و خواص سب کو بھروسہ تھا، یہاں تک کہ سرکار اودھ کی جانب سے آپ کو عہدۂ افتاء سپرد ہوا، جس کو آخر عمر تک آپ نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے، حکام کو آپ کے فتووں پر بہت زیادہ اعتبار و اعتماد تھا"

(تذکرۂ علمائے فرنگی محل مطبوعہ صفحہ ۲۰۵)

ملا محمد ولی | اور خود ملا حسن کے چھوٹے بھائی ملا محمد ولی (بن ملا غلام محمد مصطفیٰ) بھی فرنگی محل ہی

یں درس و تدریس جاری کئے ہوئے تھے، انھوں نے بھی استاذ الہند ملا نظام الدین سے اور ملا کمال الدین سہالوی (اپنے ماموں) سے پڑھا تھا، وہ مدرس بھی تھے، مصنف بھی، اُن کی ایک تصنیف شرح سلم ہے، جو مخطوط کی شکل میں بیشتر علمی ذخیروں میں پائی جاتی ہے، اس شرح کے بارے میں مولوی غلام امام خیرآبادی کا بیان ہے کہ

| | |
|---|---|
| شرح خوب ست، گویند کہ آں شرح بنظر ملا نظام الدین درآمدہ و ملا اصلاح دراں فرمودہ است. | بہترین شرح ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ یہ شرح ملا نظام الدین کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے، اور ملا صاحب نے اس میں اصلاح بھی فرمائی ہے۔ |

(آئینہ نامہ قلمی)

یہی ملا ولی فرنگی محلی ہیں، جو خیرآبادی سلسلۂ تلمذ کے نامور استاد اور شاگرد رشید مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی یعنی مولوی فضل امام خیرآبادی کے استاد ہیں، ملا ولی کے تلامذہ میں اور بھی بڑے نامور لوگ ہیں، جن میں سے ایک سید انشاء اللہ خاں مشہور شاعر بھی ہیں، خود ملا ولی کے تینوں صاحبزادے مولوی عزیز اللہ، مفتی ظہور اللہ اور مولوی نور اللہ بھی اپنے والد ماجد ہی کے شاگرد تھے، مفتی ظہور اللہ کثرت تلامذہ اور مفید ترین درسی تصانیف کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے ہیں، سرکار اودھ میں عہدۂ افتا پر مامور ہونے کے باوجود درس و تدریس میں غیر معمولی انہماک رکھتے تھے، وقائع نادر خاں کے مولف مولوی عبدالقادر رامپوری ۱۲۳۰ھ میں گشت کرتے ہوئے لکھنؤ آئے، تو فرنگی محل میں مفتی ظہور اللہ سے ملاقات کے لئے بھی آئے، یہی اس وقت فرنگی محل کے سب سے بڑے عالم تھے، اپنے روزنامچے میں (جس کا واحد قلمی نسخہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے حبیب گنج کلکشن میں ہے) انھوں نے از صنادید فرنگی محل لکھ کر مفتی ظہور اللہ کو یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ



"ایک دن مولوی ظہور اللہ صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہوا، جو صنادید (اکابرین) فرنگی محل میں ہیں، اور اپنے خاندان کے دستور کے مطابق فنون مروجہ کی تعلیم دیتے ہیں"

(فارسی سے ترجمہ)

ملا مبین | بہرحال جب ملا حسن نے فرنگی محل کو چھوڑا ہے، تو کئی مشہور فرنگی محلی مدرس فرنگی محل کے اندر درس دے رہے تھے، مگر ملا حسن کا چلا جانا علمی اعتبار سے خاندان فرنگی محل کے لئے باعث تشویش بن گیا تھا، ملا حسن کے شاگرد رشید اور ابن عم ملا محمد مبین بھی بہت فکرمند ہو گئے تھے اس سلسلے میں ملا مبین کے حقیقی بھتیجے اور شاگرد رشید ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے،

| | |
|---|---|
| ہرگاہ ملا حسن علیہ الرحمہ کہ استاد او بود از وطن بطرف ملک روہیل کھنڈ رفتہ ملا محمد مبین علیہ الرحمہ درجناب شاہ شاکر اللہ علیہ الرحمۃ حاضر شدہ حکایت رفتن ملا محمد حسن از وطن بیان آورد شاہ موصوف خطاب بوے کردہ فرمود میاں محمد مبین! محمد حسن نامے بود آں نام بشما نمادہ شد بخانہ بنشینید و درس می دادہ باشید، اعتبار شما دریں ملک زیادہ از اعتبار ملا حسن خواہد شد وہم چناں اتفاق افتاد کہ حق تعالیٰ در باطن اکثرے از امرایان آں زماں | جب ملا حسن نے جو ملا مبین کے استاد تھے، فرنگی محل سے روہیل کھنڈ کی طرف ہجرت کرلی تو ملا مبین نے شاہ شاکر اللہ (سندیلوی شاگرد ملا نظام الدین و مرید میر سید اسماعیل بلگرامی) کی خدمت میں حاضر ہوکر ملا حسن کا فرنگی محل سے چلا جانا بیان کیا، شاہ صاحب نے ملا مبین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:- میاں محمد مبین! محمد حسن ایک نام تھا، وہ نام تمھیں دے دیا گیا، جاؤ گھر گھر میں رہو، اور درس و تدریس کرو، ملا حسن سے بھی اس دیار میں |

فرنگو ساختہ کہ مثل وے درہند فاضلے
نیست چنانچہ روزے در محفل وزیرالممالک
نواب شجاع الدولہ مرحوم سید شاہ مدن
علیہ الرحمۃ مذکور ملا محمد حسن کردو ورتبہ عالیہ
او در علم بیان ساختہ امیرے قطع کلام
کردہ مدح ملا محمد مبین آغاز نمود مرتبہ
او را فوق بر رتبہ ملا محمد حسن قرار داد، وسید
شاہ مدن گفتہ کہ وے عزیز و تلمیذ ملا
محمد حسن است امیر گفت غلط است،
او تلمیذ کسے نیست شاہ مدن خاموش
ماندہ گویند کہ آن امیر مرتضیٰ خان بڑیچ
بود،

(اغصان اربعہ مطبوعہ ص ۱۴)

تمھارا اعتبار ہوگا" اور ایسا ہی اتفاق
ہوا بھی، اللہ جل شانہٗ نے اس زمانے
کے بیشتر معززین کے دلوں میں یہ
بٹھا دیا، کہ اب ہندوستان میں ملا
مبین کے ایسے درجے کا کوئی اور عالم
نہیں ہے، چنانچہ ایک روز وزیرالممالک
شجاع الدولہ کی محفل میں سید شاہ
مدن نے ملا حسن کا ذکر کیا (جو یقیناً
وہی زمانہ ہوگا، جب ملا حسن ہجرت
کرکے ضابطہ خاں کے پاس جا چکے
تھے،) اور تفصیل سے بتایا کہ علمیت میں
ان کا کیا بلند مرتبہ تھا، ایک امیر نے
شاہ مدن کی بات کاٹتے ہوئے ملا
محمد مبین کی تعریف و توصیف شروع
کردی، اور ملا مبین کو ملا حسن سے
بلند مرتبہ ٹھہرایا، شاہ مدن نے جواب
میں کہا "ملا مبین تو عزیز بھی ہیں، اور
شاگرد بھی، ملا حسن ہی کے ہیں، امیر
نے کہا بالکل غلط! ملا مبین کسی کے



شاگرد نہیں، بے چارے شاہ مدن
خاموش ہوکر رہ گئے، ان امیر کا نام
لوگوں نے امیر مرتضیٰ بڑیچ بتایا ہے،

ملا محمد مبین فرنگی محلی کا عہد سعادت علی خاں ۱۲۲۵ھ میں فرنگی محل میں انتقال ہوا، وہ ملا
نظام الدین کے وصال سے چار سال قبل ۱۱۵۷ھ میں پیدا ہو چکے تھے، اور اسی ۱۲۲۵ھ میں ملا
بحرالعلوم کا انتقال مدراس میں ہوا ملا حسن اور ان کے چھوٹے بھائی ملا محمد ولی ایک سال کے فرق سے
بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر عازم آخرت ہو چکے تھے، فرنگی محل میں ملا محمد ولی کے صاحبزادگان
نے جن میں مفتی محمد ظہور اللہ درس و تدریس میں سب سے نامور ہوئے، مشغلۂ آبائی کو جاری رکھا،
اور مفتی یعقوب کے فرزند ملا عبداللہ وس نے جو ملا حسن اور ملا غلام یحییٰ بہاری کے شاگرد تھے،
درس و تدریس کے شغل پر ایسی توجہ کی کہ عہد سعادت علی خاں میں عہدۂ افتاء قبول کرنے سے
انکار کر دیا، مدراس میں ملا بحرالعلوم کی جانشینی ملک العلماء ملا علاء الدین احمد بن مولانا احمد انوارالحق
نے کی، اُن کے بھائی مولانا نورالحق فرنگی محل میں درس و تدریس کرتے رہے، یہ دونوں بھائی ملا
علاء الدین اور مولانا نورالحق اور ان دونوں کے والد ماجد مولانا احمد انوارالحق بھی بحرالعلوم
ہی کے شاگرد تھے، ان تینوں حضرات میں کسی نے شاہجہاں پور کسی نے رامپور اور بوہار جاکر
بحرالعلوم سے اعلیٰ کتابیں پڑھ کر فراغت حاصل کی تھی، ملا بحرالعلوم کے صاحبزادوں میں بڑے
ملا عبدالاعلیٰ، (مصنف رسالہ قطبیہ) نے بھی اپنے والد ماجد ہی سے ساری تعلیم حاصل کی تھی، لیکن ان
کی وفات والد ماجد سے اٹھارہ سال قبل (۱۲۰۷ھ میں) ہوگئی، دوسرے بیٹے ملا محمد نافع بن بحرالعلوم
بھی والد ماجد کی حیات میں انتقال کر گئے، مولانا عبدالرب بن بحرالعلوم نے جن کو نواب آرکاٹ نے
سلطان العلماء کا خطاب دیا تھا، کچھ دنوں مدراس میں والد ماجد کی وفات کے بعد درس و تدریس

کی، اس کے بعد وطن واپس آکر شغل تدریس جاری رکھا، اُن کی وفات ۱۲۵۳ھ میں ہوئی، ان کے بعد اُن کے نامور فرزند مولانا عبدالحکیم نے بحرالعلوم کی جانشینی فرنگی محل میں رہ کر کی، اور اُن سے بھی فیض بہت جاری ہوا،

شمس العلماء مولانا محمد نعیم بن مولانا عبدالحکیم نے اپنے عہد تک کے علمائے فرنگی محل کے تلامذہ کی ایک فہرست تیار کی تھی، اور ملا محمد ولی فرنگی محلی کے پوتے مفتی محمد نعمت اللہ فرنگی محلی نے اس پر نظر ثانی کر کے مولانا محمد نعیم کو بعض اہم مشورے دیئے تھے، مناسب ہے کہ تلامذہ کی اس فہرست کو ان صفحات میں محفوظ کر دیا جائے، اس لئے کہ اب تک وہ مخطوطے کی شکل میں متفرق کاغذات سے منسلک ہے، بعض پہلوؤں سے اس فہرستِ تلامذہ کی بھی تاریخی اہمیت ہے، ملا نظام الدین اور ملا بحرالعلوم کے تلامذہ اس فہرست میں جو مولانا محمد نعیم کے پرپوتے مولانا محمد ناصر فرنگی محلی کے پاس محفوظ ہے شامل نہیں ہیں،

**ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا فرنگی محلی کے تلامذہ** | نواب تفضل حسین لکھنوی، مولوی محمد اسلم پسرروزی، مرزا حجو لکھنوی، مولوی ازہار الحق بن ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی، ملا محمد مبین فرنگی محلی، ملا عبدالاعلی بن بحرالعلوم فرنگی محلی، مولوی حبیب اللہ فرنگی محلی، مولوی نورالحق فرنگی محلی، مولوی سعدالدین بن ملا احمد حسین فرنگی محلی،

**تلامذہ ملا حسن فرنگی محلی** | مولوی سید یحییٰ عرف مسافر عظیم آبادی، مولوی عبداللہ رامپوری، ........ مولوی محمد قائم، مولوی غلام نبی خاں شاہجہاں پوری، مولوی عبدالرزاق رامپوری، قاضی حسام الحق موہانی، مولوی محمد وحید موہانی، نواب تفضل حسین خان لکھنوی، مولوی محمد اسلم پسرروزی، حافظ اصغر علی فیض آبادی، شیخ فصیح الزماں احمد پوری، مولوی محمد مستقیم گوپامئوی، مولوی امجد علی قادری اکبرآبادی، شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی، مرزا رضی لکھنوی، میر خیر اللہ حسینی بنگالی (شہید)، مرزا حجو لکھنوی، مولوی عماد الدین لبکنی، مولوی مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی، مولوی اظہار الحق فرنگی محلی،



مولوی عبدالقدوس فرنگی محلی، ملا عبدالاعلی فرنگی محلی، ملا محمد مبین فرنگی محلی، ملا مولوی حبیب اللہ فرنگی محلی، مولوی عبدالغنی فتح پوری، قاضی محمد رکن الدین کیرانی، فتح پوری، فرنگی محلی، مولانا شاہ احمد انوار الحق، (یہ ملا نظام الدین کے تلامذہ میں تھے اور شاہ شاکر اللہ سندیلوی، ...... علمی رامپوری، حافظ ...... معلوم ہوتا ہے کہ ملا حسن سے بھی کچھ پڑھا ہوگا،)

**تلامذہ ملا محمد ولی فرنگی محلی** | قاضی سراج الدین علی خاں موہانی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی، انشاء اللہ خاں شاہجہاں پوری لکھنوی، مولوی محمد نافع فرنگی محلی، مولوی عزیز اللہ فرنگی محلی، مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی، مولوی نور اللہ فرنگی محلی، مولوی نظام الدین دیوی، مولوی احسان اللہ اناوی، مولوی حامد بہرائچی، مولوی فضل امام خیرآبادی، مولوی عبدالواجد خیرآبادی (مولوی نعمت اللہ نے مولوی عبدالواجد کے تلمذ کی تصدیق نہیں کی)

**تلامذہ مفتی ظہور اللہ فرنگی محلی** | مولوی عبدالرحیم صفی پوری، مولوی فضل رسول بدایونی (ساتھ یہ بھی تحریر ہے کہ مولوی فضل رسول انکار کردند") مولوی یاد علی نصیرآبادی، مولوی ہادی دیوی، مولوی احسان اللہ اناوی، مولوی کفایت اللہ مرادآبادی معروف بہ کافی شاعر (راجہ امداد علی خاں کنتوری) مولوی امداد علی حدیث خواں، منشی عبدالکریم لکھنوی، احسان حسین خاں لکھنوی، حکیم واجد علی خاں موہانی، مولوی فضل امام موہونی، مولوی عبدالقادر لکھنوی، مولوی غنی نقی، زید پوری، مولوی مسیح الدین خان کاکوروی (سفیر اودھ) مولوی احمد علی محمد آبادی، مولوی احمد علی چریاکوٹی، مولوی محمد سعید عظیم آبادی (اس کے ساتھ لکھا ہے، مولوی نعمت اللہ منسوخ کردند") مولوی ابوالحسن پنجابی عظیم آبادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی، مولوی منظر علی خان لکھنوی، اخوند شیر محمد ولایتی شاہ احمد سعید دہلوی، مولوی عبدالقادر فیض آبادی، مولوی جلال الدین رام پوری، مولوی سعد اللہ مرادآبادی (مفتی اودھ) مولوی جعفر علی کسمنڈوی) مولوی قدرت علی رودولوی، مفتی عبدالسلام انجوی، مولوی تفضل علی سندیلوی، مولوی محمد حنیف دھتوری، مولوی صبغۃ اللہ بلگرامی، مولوی

محمد صادق لکھنوی، مولوی حسین احمد ملیح آبادی (محدث) قاضی امین الدین فتح پوری، مولوی برہان الحق
فرنگی محلی، مولوی محمد حیدر فرنگی محلی، مولوی ظہور علی فرنگی محلی، مولوی محمد اسحاق رام پوری، مولوی
نجم الدین رامپوری، منشی عبد الواحد رام پوری، (شاگرد مولوی اسماعیل لندنی ہم بود) مولوی
محمد حامد فرنگی محلی، مولوی محمد امین الحق فرنگی محلی، مولوی محمد غضنفر فرنگی محلی، مولوی خادم احمد
فرنگی محلی، مولوی غلام یحییٰ فرنگی محلی، مولوی غلام زکریا فرنگی محلی، مولوی غلام محمد فرنگی محلی، مولوی
محمد نور کریم دریابادی، مولوی محمد معین الدین کرٹاوی، مولوی محمد خلیل اللہ فرنگی محلی، مولوی اسد اللہ
فرنگی محلی، مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی، مولوی رحمت اللہ فرنگی محلی، مولوی محمد امین اللہ فرنگی محلی
مولوی محمد عبد الحلیم فرنگی محلی، مولوی محمد یوسف فرنگی محلی، مولوی محمد عیسیٰ فرنگی محلی، حکیم رضا علی لکھنوی
حکیم ابو سعد اٹاوی، مولوی اکبر علی فتح پوری، محمد مراد بنگالی، مرزا محمد مستقیم الہ آبادی، (جو مولوی
اسماعیل لندنی کے استاد تھے) مولوی نور اللہ فرنگی محلی، قاضی سعید الدین سہالوی، مرزا خیر اللہ لکھنوی
مولوی عبد المجید بدایونی، مولوی فضل علی (یہ مولوی فضل علی سندیلوی کے علاوہ دوسرے صاحب ہیں)
مولوی تفضل علی جون پوری، مولوی عبد الحفیظ ملیح آبادی، مولوی ممتاز علی جائسی، مولوی سرفراز علی خان
(کہ در عظیم آباد مفتی عدالت بودند) حکیم سید محمد لکھنوی، حکیم مرزا کلو لکھنوی، مولوی حافظ محمد (ہمشیرزادہ
مولوی مراد بنگالی،) شیخ محمد حسین لکھنوی، مولوی عطا حسین (کہ در مسجد مولوی حیدر مرحوم قیام می داشتند)
مولوی اسماعیل متوطن چھپرہ، حکیم غلام نجف سندیلوی، مولوی محمد ولایتی، حکیم بو علی سندیلوی، حکیم ابو البقا
متوطن سندیلہ، حکیم تنا لکھنوی، پسران حکیم بنا لکھنوی، مولوی نجف علی عظیم آبادی، مولوی علی قلی خان
کنتوری، مولوی منو بنارسی، مولوی اشرف علی ردولوی، مولوی ارادت حسین بنگالی، مولوی غلام علی
متوطن لمر پور کھیری، مولوی غلام علی بنگالی، مولوی میر سید محمد ردولوی، مرزا عباس لکھنوی، پنڈت
بخت مل لکھنوی، حکیم اماد حسین خاں موہانی، مولوی عظیم الدین سرہندی، مولوی پیر بخش (متوطن



حضرت کچھوچھ، استاد مسیح الدولہ) حکیم کلو لکھنوی، (حکیم مرزا کلو لکھنوی سے مختلف یہ صاحب ہیں)
مولوی ثابت علی الہ آبادی، مولوی عنایت الدین پنجابی (کہ در مدرسہ کلکتہ مدرس بودند) مولوی پناہ علی
پنجابی، مولوی امانت اللہ بنگالی، مولوی دیانت اللہ بنگالی، حکیم فرخ حسین بنگالی، حکیم مرزا محمد برادر
حکیم مرزا محمد شریف لکھنوی) مولوی شکر اللہ الہ آبادی، (ابن شاہ حجۃ اللہ) مولوی مجد الدین، پسر
مولوی عبد الحکیم پنجابی، منشی مصلح الدین علی نقی خاں ملانوی، حکیم میر زاہد علی اودھی، حفیظ الدولہ
مولوی باقر علی اودھی، (استاد امجد علی بادشاہ اودھ) مولوی اعظم علی بنگالی، حکیم معصوم علی، مولوی
بادی علی بنگالی، میر غلام علی بریلوی،

| تلامذہ ملا نور اللہ بن ملا محمد ولی فرنگی محلی | مولوی اسد اللہ فرنگی محلی، مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی، مولوی رحمۃ اللہ فرنگی محلی، (یہ تینوں ملا نور اللہ کے صاحبزادگان ہیں)، |
| --- | --- |

مولوی امین اللہ فرنگی محلی، مولوی ظہور علی فرنگی محلی، مولوی محمد یوسف فرنگی محلی، مولوی عبد الغفار
فیض آبادی، منشی الملوک کنور رتن سنگھ، مولوی جعفر علی کسمنڈوی، مولوی یاد علی نصیر آبادی، مولوی
مظہر علی خان لکھنوی، حکیم واجد علی موہانی، مولوی نور کریم دریابادی، مولوی ثابت علی الہ آبادی
محمد سمیع زمان (ساکن توپ دروازہ) مولوی غلام یحییٰ خان فرنگی محلی، مولوی محمد حیدر فرنگی محلی، مولوی
تفضل علی جون پوری، مولوی عبد الکریم لکھنوی، منشی عبد الکریم لکھنوی، پنڈت بخت مل لکھنوی
میر نثار علی فیض آبادی، مولوی نعیم اللہ موہانی، حکیم وارث علی موہانی، مولوی میر سید محمد ردولوی
مولوی عبد الحکیم پنجابی، (کہ در نخاس قیام می داشتند) مولوی مرزا کاظم علی (برادر فتح الدولہ مرزا
محمد رضا برق لکھنوی) مولوی محمد مستقیم الہ آبادی (استاد میر اسماعیل لندنی) مولوی عبد الرحمن ولایتی
مولوی نظام شاہ آبادی، مولوی ممتاز علی جائسی، مولوی نور الدین ولایتی، مولوی غلام مولیٰ
مولوی حیدر علی فیض آبادی،

**تلامذہ مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی**

شاہ غلام اعظم الٰہ آبادی، شاہ اکرام اللہ الٰہ آبادی، مولوی تفضل حسین فتح پوری، مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، مولوی انور علی مراد آبادی، مولوی محمد معین الدین کروڑی، حکیم ہدایت اللہ صفی پوری، حکیم سید محمد موہانی، حکیم غازی لکھنوی، مولوی امیر علی کنتوری، مولوی ارشاد حسین عظیم آبادی، مولوی ابو نصر عظیم آبادی، مولوی علیم الدین حسین عظیم آبادی، مولوی محمد حامد فرنگی محلی، مولوی فخر الدین احمد فرنگی محلی، مولوی ابو الحسن فرنگی محلی، مولوی عبد الحلیم فرنگی محلی، مولوی لعمان یحیٰ فرنگی محلی، حافظ عبد الصمد کاکوروی، ملا نواب ولایتی، حافظ محمد سورتی، مولوی نجم الدین رامپوری، مفتی عبد الواحد رامپوری، حکیم ابو الحسن کرنادی، مرزا علی عباس چریا کوٹی، حکیم مظفر حسین خاں، میر قائم علی وکیل جونپوری (منصف) اخوند علی محمد ولایتی، حکیم نواب مرزا لکھنوی، حکیم رحمت اللہ، مولوی محمد رحمت اللہ فرنگی محلی، شیخ محمد بخش شہید، حکیم محمد ابراہیم ابن حکیم محمد یعقوب، مولوی کرامت اللہ فرنگی محلی، خواجہ شمس الدین کشمیری، مولوی مرزا محمد علی (کلکتہ) مرزا باقر، شیخ عنایت اللہ کشمیری، مرزا عباس، علی محمد خاں، سید مہدی معروف بہ سید میرن جان، پنڈت شیو نرائن کشمیری، مولوی غلام قادر فرنگی محلی، میر احمد مفتی گنج، مرزا مہدی، مرزا علی قلی، میر عباس نواز گنجی، حکیم مرزا مقصود علی کشمیری، مولوی حمید الدین (کہ در مسجد شاہ عبد الرحمٰن مغفور قیام می داشتند و در عدالت فوجداری نوکر بودند)، مولوی حبیب الرحمٰن، شیخ محمد لطف، شیخ بیتاب، مولوی اسحاق، شیخ نیاز علی، مولوی محمد جعفر سندیلوی، حکیم سید محمد ہاشم علی خاں بن حکیم کاظم علی خان، حکیم سید محمد باسط علی خاں، حکیم سید محمد رسول خاں، حکیم سید قربان علی، حکیم سید قاسم علی، مولوی مسند علی، مولوی تراب علی، حکیم نوازش علی، حکیم مولوی فخر الدین الٰہ آبادی، مولوی رستم علی گورکھپوری، مولوی عبد الاعلیٰ بنارسی، مولوی مدد علی بنارسی، مولوی محمد فاروق چریا کوٹی، پنڈت رام نرائن عظیم آبادی، مولوی متشرع (کہ در مسجد شاہ مینا قدس سرہ مقیم بودند) مولوی نعمت اللہ فرنگی محلی کے تلامذہ کی فہرست بہت



طویل ہے، اور ان میں سے بیشتر کے وطن کا ذکر نہیں ہے، صرف نام ہیں، جن کا اعادہ کچھ مفید نہ ہوگا، خود مولوی نعمت اللہ نے فہرست تلامذہ میں لکھا ہے کہ پنجاب، ہانسی، بریلی، مرادآباد، سہسوان، رامپور، بمبئی، بڑودہ، سورت، برہان پور، الٰہ آباد، جون پور، غازی پور، اعظم گڑھ، علی گنج، سیوان، مظفر پور، کڑہ، جہان آباد، بنارس، چھپرہ، عظیم آباد، چریا کوٹ، تبیا و بہار، اودھ کے بہت سے تلامذہ کے نام یاد نہیں آرہے ہیں،

شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نے مولانا نعمت اللہ بن نور اللہ ابن ملا ولی فرنگی محلی کو اپنی تیار کردہ فہرست تلامذہ بھیجی تھی، اس وقت مولانا نعمت اللہ بڑودہ میں تھے، مولانا نعمت اللہ نے ۱۶ صفر ۱۲۸۶ھ کو ایک خط کے ساتھ حک و اضافہ کرکے فہرست واپس کردی، مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی کا سفر سے وطن واپس ہوتے ہوئے بنارس میں ۱۲۹۰ھ میں انتقال ہو گیا، اور وہیں تدفین عمل میں آئی، کہا جاتا ہے، کہ شیخ علی حزیں کے پہلو میں دفن کئے گئے،

مولانا نعمت اللہ نے اپنے جوابی خط میں یہ بھی نشان دہی کی ہے کہ ملا محمد رضا فرنگی محلی کی شرح سلم جو مفقود معلوم ہوتی ہے، اُن کے مطالعے سے گذری تھی، وہ لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| شرح سلم حضرت ملا محمد رضا نزد حکیم مرزا غازی معائنہ کردہ بودم، | حضرت ملا محمد رضا (ابن ملا قطب شہید) کی شرح سلم میں نے حکیم مرزا غازی کے پاس (جو مولانا نعمت اللہ کے شاگرد تھے) دیکھی تھی، |

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی اور مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی کی یادداشتوں سے مذکورہ بالا صفحات پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ مکمل بھی نہیں ہے، اور ملا صاحب کے وصال کے بعد کے ڈیڑھ سو برس کو بھی پوری طرح حاوی نہیں ہے، اب اس سلسلے کے چند ممتاز شاگردوں کے نام ان ہی یادداشتوں

سے لکھ کر اس سلسلے کی مزید تفصیل کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھنا مناسب ہے،

مفتی محمد عباس لکھنوی (شاگرد مولوی عبدالقدوس فرنگی محلی) مولوی امیر علی شہید امیٹھوی اور مولوی غلام امام شہید الٰہ آبادی (شاگردان مولوی اسد اللہ فرنگی محلی) مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی اور سید اولاد حسن والد ماجد نواب سید صدیق حسن خان بھوپالی (شاگردانِ مولانا نور الحق ابن مولانا احمد انوار الحق فرنگی محلی) مولانا شاہ فضل رسول بدایونی، مولانا نور الحق فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے، جن کی دستار بندی کی رسم ردولی شریف (ضلع بارہ بنکی) میں حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی کے عرس کے موقع پر ادا کی گئی، مولوی وجیہ الدین اشرف مصنف بحر زخار (شاگرد مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی شاگرد ملا نظام الدین) مولوی مرزا حسن علی محدث لکھنوی (شاگرد مولوی محمد ابوالرحم فرنگی محلی) مولوی کرم احمد مینائی (شاگرد مفتی محمد اصغر فرنگی محلی) مولوی حیات حسین مینائی منشی طالب حسین مینائی، منشی امیر احمد مینائی امیرؔ (معاصر داغ) اور مولوی بندہ حسن لکھنوی (شاگردان مفتی محمد یوسف فرنگی محلی) مفتی محمد یوسف فرنگی محلی فرنگی محل میں درس دیتے، اور سرکار اودھ کے عہدہ افتاء کے فرائض انجام دیتے رہے، انتزاع سلطنت اودھ کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور میں مدرس اعلیٰ ہو کر فرائض تدریس انجام دیتے رہے، ان سے قبل مدرسہ حنفیہ جون پور میں ان کے عزیز اور شاگرد مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبدالحی فرنگی محلی) صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے، جب وہ حیدرآباد دکن بلا لئے گئے، تو انہوں نے اپنے استاذ مفتی محمد یوسف کو مدرسہ حنفیہ کا ذمہ دار بنا دیا، یہ ۱۲۷۷ھ کی بات ہے، مفتی محمد یوسف اور مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کے بکثرت تلامذہ یوپی کے مشرقی اضلاع میں تھے، مفتی محمد یوسف کا ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں،

ملا محمد مبین فرنگی محلی اور ان کے ارشد تلامذہ ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی (مصنف عمدۃ الوسائل



ملحقات واغصان اربعہ وتفسیر معدن الجواہر) کے تلامذہ کی فہرست بھی خاصی لمبی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی وفات ۱۲۷۰ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ہوئی، وہ کثیر التصانیف وکثیر التلامذہ تھے، سرکار اودھ کے مفوضہ فرائض کی بجا آوری کے ساتھ اُن کے علمی مشاغل معیاری پیمانے پر جاری رہے، اُن کے تلامذہ میں علاوہ حضرات فرنگی محل کے چند حضرات یہ ہیں:-

مولوی نظام العالم خیرآبادی، ملا نثار احمد ولایتی، مولوی محمد نقی لکھنوی، مولوی سید انور علی [illegible] آبادی، مولوی محمد امین مچھلی شہری، حکیم فخر الدین الٰہ آبادی، مولوی نجف حسین نگیسری، مولوی محمد حسن بدایونی، مولوی محمد لطف اللہ زمینوی، مولوی صاحب عالم مارہروی، مفتی بندہ حسن لکھنوی، حکیم زین العابدین عرف منجھلے، نواب مہدی علی خاں (عم نواب علی نقی خاں بہادر) وغیرہ،

تلامذہ علمائے فرنگی محل کی اس طول طویل فہرست کے پیش کرنے کی غرض یہ بھی ہے کہ اس سے ملا نظام الدین فرنگی محلی کے تیار کردہ درس نظامی کی جامعیت اور مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جامعیت اس پہلو سے کہ اس فہرست میں ایسے متعدد نام نظر آئیں گے جنہوں نے اسی درس کو پڑھ کر بڑے بڑے ملکی اور انتظامی عہدے سنبھالے اور کسی قسم کی نااہلی کا ثبوت نہیں دیا، گویا اس عہد کے سرکاری نظم ونسق کی ضرورتوں کو درس نظامی بالکل اسی طرح پوری کر رہا تھا جس طرح آج کل سرکاری ملازمتوں کے لئے یونیورسٹی کی ڈگریاں ہیں، اس فہرست میں ایسے نام بھی بکثرت ہیں جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اور بڑی کامیابی سے اس کو انجام دیا، گویا درس نظامی کا فارغ التحصیل اپنے زمانے میں اسی صلاحیت کا مالک مانا جاتا تھا، جس طرح آج تدریسی منصب پر فائز ہونے کے لئے اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حصول کو لازم قرار دیا جاتا ہے، اور درس نظامی کی مقبولیت کا اندازہ اس پہلو سے کیا جانا چاہئے کہ اس کے

حلقے میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کے لئے کشش تھی، شیعہ سُنی، اور ہندو کا کوئی فرق نہ تھا، منشی الملوک منشی رتن سنگھ، اور پنڈت بخت مل لکھنوی وغیرہ ایک طرف تھے، اور علامہ تفضل حسین اور مفتی میر عباس لکھنوی دوسری طرف اور مولوی غلام امام شہید، مولوی فضل امام خیر آبادی اور حکیم فخر الدین الہ آبادی وغیرہ تیسری طرف، یہ سب ایک دائرے میں اکٹھا ہو کر پہلو بہ پہلو بیٹھے اور استاد درس نظامی سے یکساں فیض حاصل کرتے تھے،

مُلا نظام الدین فرنگی محلی نے حویلی فرنگی میں اٹھارھویں صدی کے بالکل آغاز یا سنہ ۱۱۱۲-۱۱۱۳ھ میں بیس بائیس سال کی عمر میں درس و تدریس کا ایک بیج بویا تھا جو دیکھتے دیکھتے سایہ دار درخت ہو گیا، پچاس سال تک وہ اس کی آب یاری کرتے رہے، اور یہ درخت پھلا پھولا، اور شاخوں نے سارے ہندوستان کو کم و بیش اپنے سایہ میں لے لیا، خود فرنگی محل کے اندر اس درخت کی جو شاخیں تھیں، وہ شاخ در شاخ ہوتی رہیں، اور جس حد تک اس مضمون میں ہم پہونچے ہیں، وہ ملا نظام الدین کے وصال کے پورے سو سال (سنہ ۱۲۶۴ھ) تک کا زمانہ ہے، یہی ۱۲۶۴ھ وہ سال ہے جب خاندان فرنگی محل کا ایک شہ سوار تدریس و تصنیف پر وہ عدم سے وجود میں آیا، یہ علامہ ابو الحسنات محمد عبد الحیٔ فرنگی محلی کا سال پیدائش ہے، اس وجود نے مسند درس پر قدم رکھتے ہی ماہتاب و آفتاب بن کر شب در وزدہ نورِ علمی بکھیرا کہ ہندوستان ہی نہیں، تمام ممالک اسلامیہ اس کے نور کی شعاعوں سے روشن ہو گئے، اور آج بھی جب کہ اس آفتاب کے غروب ہوئے ۵ اکم سو سال ہو رہے ہیں، اس کی روشنی افق علمی کے دھندلکے کو منور کئے ہوئے ہے،

ملا نظام الدین کے بعد کے سو سال ہی ہم نے لئے ہیں، اس کے بعد جن اساتذۂ فرنگی محل کی رونق درس بڑھی، اس کی تفصیل میں جانے سے ہم اپنے عنوان سے بہت دور جا پڑیں گے، گو اب بھی کافی دور اس شوق میں نکل آئے ہیں، کہ ملا نظام الدین کا جلوہ ذرا دور ہو کر بھی دیکھ لیں،

دور جا کر دیکھئے نزدیک آ کر دیکھئے	ہم سے ہو سکتا تو ہم اُن کو برابر دیکھئے



# قرطاس اور کاغذ
## تاریخ کی روشنی میں

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی

(۲)

(۲) کتابت کے لئے چمڑے کا استعمال باوجود اپنی صفائی اور فراوانی کے قرطاس میں یہ نقص تھا کہ وہ کافی طور پر مضبوط اور پائدار نہ تھا، اس لئے اہم دستاویزوں اور نوشتوں کے لئے قدیم زمانے کے لوگ صاف شدہ چمڑا استعمال کرتے تھے، خصوصاً اہلِ ایران اہم تحریروں کے لئے چمڑا ہی کام میں لاتے تھے، چنانچہ ابن الندیم بغدادی نے تصریحاً لکھا ہے کہ کانتِ الفرسُ تکتبُ فی جلود الجوامیس والبقر والغنم (کتاب الفہرست، ص ۳۱) یہی دستور یونانیوں کا تھا، جیسا کہ سقراط کے ایک مقولہ سے ظاہر ہے، کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے کتابوں کی تالیف کیوں چھوڑ دی ہے، اس نے جواب دیا کہ "میں علم کو زندہ لوگوں کے دل و دماغ سے نکال کر مردہ بھیڑ بکری کی کھال میں منتقل نہیں کروں گا"، اسی قسم کے مقولے بقراط کی طرف بھی منسوب ہیں[1]،

---

[1] قال سقراط حین سُئل عن ترکہ تصنیف الکتب "لستُ بناقلٍ للعلم من قلوب البشر الحیۃ الی جلود الضأن المیتۃ" (کتاب الہند للبیرونی ص ۸۰) (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۶ پر)

یونانی لکھنے کے چمڑے کے لئے دفتیرہ (Diphthera) کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی جلد یا کھال کے ہیں، اور بعض امرائے مغرب کا خیال ہے کہ فارسی کا لفظ "دفتر" اسی کلمہ سے ماخوذ ہے[1]، مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس جس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے لکھتا ہے کہ "یونانی حال کی بعض اقوام کی طرح پہلے زمانہ میں دفتیرا یعنی چمڑے پر لکھتے تھے، اور وہ اس لفظ کو ابھی تک پپائرس (Papyrus) یعنی قرطاس کے طومار کے لئے استعمال کرتے ہیں"

کتابت کے لئے چمڑا تیار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ بھیڑ بکری یا بچھڑے کی کھال لے کر اسے چونے کے پانی میں ڈال دیتے تھے جس سے اس کے بال اتر جاتے تھے، بعد ازاں اسے خشک کر کے اس پر پسی ہوئی کھریا مٹی ملتے تھے، اور پتھر سے گھوٹ کر اس کی سطح کو صاف اور ملائم بنا لیتے تھے، ایشیائے کوچک کا شہر پرغامم (Perghamum) اس قسم کے چمڑے کی دباغت اور ساخت کے لئے خاص طور پر مشہور تھا، اس لئے لکھنے کا چمڑا اسی شہر کے نام پر (Chart Perghamum) یعنی "پرغامم کا ورق" کہلایا۔ انگریزی زبان کا لفظ پارچمنٹ (Parchment) اسی سے ماخوذ ہے، اس قسم کے چمڑے کو انگریزی میں (Vellum) بھی کہتے ہیں،

رق | اوائل اسلام میں بھی چمڑا لکھنے کے لئے استعمال ہوا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے نام جو تبلیغی مراسلہ بھیجا تھا، وہ چمڑے پر مرقوم تھا، اسی طرح خیبر کے یہود کے ساتھ آنحضرتؐ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۵) قال لہ تلمیذہ: لو املیت علی کتاباً یُخلّد عنک؛ قال لہ بقراط: الحکمۃ لا تحتاج الی جلود الضأن (تاریخ یعقوبی طبع بیروت جلد اول ص ۱۲۸)

قال لہ لیماوس: ایّھا الحکیم، لِمَ لا تدوّن لنا حکمتک فی المصاحف، فقال لہ بقراط: یا لیماوس، ما دنقت بجلود البھائم المیتۃ (بحوالہ مذکورہ بالا)

[1] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائیڈن) طبع ثانی جلد دوم ص ۷۷،



کا جو معاہدہ ہوا، وہ بھی چمڑے پر لکھا گیا تھا، اس قسم کے چمڑے کو رق کہتے تھے، چنانچہ کتب لغت میں رق کی تشریح یوں آئی ہے، جلدٌ رقیقٌ یکتب فیہ۔ قرآن پاک میں رق کا جو لفظ آیا ہے اس سے لکھنے کا چمڑا ہی مقصود ہے (وَالطُّوْرِ وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ سورۂ طور) رق کا لفظ جاہلی شعرا کے کلام میں بھی آیا ہے، اور حبشی زبان میں بھی اسی معنی میں مستعمل ہے،

طرس | اگرچہ کتابت کا چمڑا مضبوط اور پائدار ہوتا تھا، لیکن گراں قیمت تھا، اس لئے اس کا استعمال عام نہ ہو سکا، بعض لوگ ضرورت کے وقت چمڑے کی پہلی تحریر کو دھو کر یا کسی اور طرح سے محو کر کے اس پر دوسری عبارت لکھتے تھے، اس قسم کے چمڑے کو جس پر ایک سے زیادہ عبارتیں یکے بعد دیگرے لکھی جائیں انگریزی میں (Palimpsest) کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں طرس کا لفظ آیا ہے، جس کی جمع طروس یا اطراس آتی ہے، ابن الندیم عباسی عہد کے متعلق لکھتا ہے کہ اَقَامَ النَّاسُ بِبَغْدَادَ سِنِیْنَ لَا یَکْتُبُوْنَ اِلَّا فِی الطُّرُوْسِ لِاَنَّ الدَّوَاوِیْنَ نُھِبَتْ فِیْ اَیَّامِ مُحَمَّدِ بْنِ زُبَیْدَۃَ وَکَانَتْ فِیْ جُلُوْدٍ فَکَانَتْ تُمْحٰی وَیُکْتَبُ فِیْھَا (الفہرست ص ۳۲) یعنی بغداد کے لوگ کئی برس تک صرف طروس ہی پر لکھتے رہے، کیونکہ سیدہ زبیدہ کے فرزند محمد (الامین) کے عہد میں سرکاری دفتر (یعنی رجسٹر) لٹ گئے تھے، جو چمڑے پر مرقوم تھے، اس لئے ان کی تحریروں کو مٹا کر لوگ انہی پر لکھتے رہے"

قرطاس اور چمڑے (یا رچمنٹ) کی موجودگی میں بھی دنیا کو ایسے سامانِ نوشت کی ضرورت تھی، جو ارزاں اور عام ہو، اس ضرورت کو اہل چین نے کاغذ ایجاد کر کے پورا کیا،

(۳) کاغذ کی ایجاد اور رواج پذیری | منجملہ ان ایجادوں کے جن کے لئے ساری دنیا اہل چین کی ممنون ہے، اور جن کے رواج عام سے تہذیب و تمدن نے عظیم الشان ترقی کی ہے، اور علوم و فنون میں بالخصوص غیر معمولی اشاعت پائی ہے[1]، کاغذ کی ایجاد بھی شامل ہے

[1] ص ۳۷۵ پر دیکھئے؛

قدیم چینی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش سے تقریباً ایک سو سال بعد ایک شخص سائی لون (Tsai Lun) نے جو شاہی سلاح خانہ کا منتظم تھا کاغذ ایجاد کیا، اس سے پہلے چینی بانس پر لکھتے تھے، پھر اس مقصد کے لئے سفید ریشمی کپڑا استعمال کرنے لگے، لیکن ریشمی کپڑا بیش قیمت تھا، اس لئے اس کا رواج عام نہ ہو سکا،

سائی لون نے پرانے چیتھڑوں، ماہی گیروں کے پرانے جالوں، گھاس پھوس، درختوں اور بالخصوص توت کی چھال سے کاغذ تیار کیا، اس کے اہلِ وطن نے اس ایجاد کو بہت مفید پایا، اور اس کی اہمیت اور افادیت کو دیکھ کر موجد کی ذہانت اور خدمت گذاری کا کما حقہٗ اعتراف کیا، چنانچہ حکومتِ چین کی مجلسِ وزراء نے ۱۰۵ء میں سرکاری طور پر سائی لون کی تحسین کی، اور بعد کے زمانے میں بھی اس کی ایجاد کی یاد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہی، چنانچہ مدت دراز تک اس کا گھر اور وہ پتھر جس پر وہ کاغذ سازی کے لئے مسالہ مہیا کرتا تھا یادگار اور خاص و عام رہا،

چینی کاغذ کے سب سے پرانے نمونے جو تا حال دستیاب ہوئے ہیں، وہ ہیں جو سر آرل سٹائن (Aurel Stein) نے شرقی ترکستان کے غاروں میں دریافت کئے تھے، جو اب برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، ان کا زمانہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی ہے اور بدھ مت کی

---

(حاشیہ ص ۳۷۷)

۱ اہلِ چین نے وقتاً فوقتاً چند ایک ایسی مفید عام اشیاء ایجاد کی ہیں جن کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اور جو اپنے رواج عام کی وجہ سے انسانی تمدن کا جزء لاینفک بن چکی ہے، ان اشیاء میں کاغذ کے علاوہ حسبِ ذیل اشیاء قابلِ ذکر ہیں، (۱) چینی ظروف جن کو انگریزی میں Porcelain کہتے ہیں (۲) ریشم اور ریشمی پارچہ جات (۳) قطب نما جس کی ساخت میں چینیوں نے مقناطیس استعمال کیا تھا، (۴) چائے کا استعمال بحیثیت ایک مشروب کے،



کی مذہبی تحریریں ہیں، جب ان کو خوردبین سے بغور دیکھا گیا، تو معلوم ہوا کہ اُن کی ساخت میں درختوں کی چھال اور سَن کے ریشے کام میں لائے گئے تھے،

اوائل عہدِ اسلام میں چین سے بحری تجارت کے ذریعہ سے جو اشیاء، اسلامی ملکوں میں درآمد ہوتی تھیں، اُن میں چینی کاغذ کا بھی ذکر آیا ہے،

**کاغذ کا رواج اسلامی ملکوں میں**

مسلمان کاغذ سازی کی صنعت سے کیسے واقف ہوئے؟ اس سلسلہ میں عربی اور چینی مصادر کے بیانات کو یکجا دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کاغذ کی صنعت اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سمرقند میں جاری ہوئی، اور پھر وہاں سے دوسرے اسلامی ملکوں میں پھیلی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک بھاری چینی لشکر فرغانہ کے ترک حکمران کی امداد کے لئے آیا تھا، لیکن سمرقند کے عرب والی زیاد بن صالح خزاعی نے اسے وادی ایلی میں دریائے طراز کے نزدیک ۱۳۳ھ مطابق ۷۵۱ء میں شکست فاش دی، اور ہزاروں چینیوں کو پکڑ کر اپنے صدر مقام یعنی سمرقند میں لے آیا، ان چینی اسیروں میں بعض کاغذ بنانا جانتے تھے، چنانچہ انھوں نے سمرقند میں کاغذ سازی شروع کر دی، غالباً اس ارادے سے کہ کچھ روپیہ پیسہ کما کر اتنی رقم جمع کر لیں جس سے فاتحین کو زرِ فدیہ دے کر آزادی حاصل کر سکیں، بہر حال اُن کے ذریعہ یہ صنعت سمرقند میں جاری ہو گئی، اور یہ شہر رفتہ رفتہ کاغذ سازی کا بہت بڑا مرکز بن گیا، اور یہاں کا کاغذ بڑی افراط سے دساور کو جانے لگا، اور سمرقند کا نام اپنے عمدہ کاغذ کے لئے دور دور تک مشہور ہو گیا،

ابن الاثیر نے اپنی تاریخ میں ۱۳۳ھ کے ذیل میں مذکورہ بالا جنگ کا حال حسبِ ذیل الفاظ میں لکھا ہے :-

| | |
|---|---|
| وفیها تخالف اخشید فرغانة | اس سن میں فرغانہ کا اخشید اور چاچ کا |
| وملک الشاش فاستمد اخشید | بادشاہ آپس میں جھگڑ پڑے، اور اخشید |

ملك الصين فامده بمائة
الف مقاتل فحصروا ملك
الشاش فنزل على حكم ملك
الصين فلم يتعرض له
ولا لاصحابه بما يسوءهم
وبلغ الخبر ابا مسلم فوجه
الى حربهم زياد بن صالح
فالتقوا على نهر طراز فظفر
بهم مسلمون وقتلوا منهم
زهاء خمسين الف واسروا
نحو عشرين الفا وهرب الباقون
الى الصين وكانت الواقعة فى
ذى الحجة سنة ثلاث وثلاثين
ومائة [1]

نے چین کے بادشاہ سے امداد طلب کی،
اس نے اس کی مدد کے لئے ایک لاکھ
جنگجو بہادر بھیجے، جنھوں نے شاہ چاچ
کا محاصرہ کرلیا، شاہ چاچ نے فغفور
چین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے"
فغفور نے بھی اس کے اور اس کے ساتھیوں کے
کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ
رکھی، اور جب ابو مسلم (والی خراسان)
کو یہ خبر پہونچی تو اُس نے زیاد بن صالح
کو ان سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا،
چنانچہ دریائے طراز کے کنارے اُن
کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں نے اُن پر
فتح پائی، اور اُن کے تقریباً پچاس
ہزار آدمی قتل کر ڈالے، اور تقریباً
بیس ۲۰ ہزار کو اسیر کر لیا، اور باقی لشکری
چین کی طرف بھاگ گئے، یہ جنگ
ذوالحجہ ۱۳۳ھ ہجری میں واقع ہوئی
تھی،

[1] امام طبری نے عربوں اور چینیوں کی اس جنگ کا کہیں ذکر نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ ابن الاثیر



اگرچہ ابن الاثیر نے چینی قیدیوں کے ضمن میں ان کی کاغذ سازی کا ذکر نہیں کیا، لیکن دیگر متعدد مصنفین نے اس کی وضاحت کر دی ہے، کہ سمرقند میں کاغذ کی صنعت انہی اسیروں کے ذریعہ سے جاری ہوئی تھی، چنانچہ ابو منصور عبدالملک بن محمد ثعالبی نیشاپوری (متوفی ۴۲۹ھ) نے لطائف المعارف میں لکھا ہے کہ

من خصائص سمرقند الكواغيد
التى عطلت قراطيس مصر
والجلود التى كانت الاوائل
يكتبون فيها لانها احسن و
انعم وارفق و اوفق ولا
تكون الا بها وبالصين، و
ذكر صاحب المسالك و
الممالك انه وقع من الصين
الى سمرقند فى سبى سباهم
زياد بن صالح من اتخذ
الكواغيد بها ثم كثرت
الصنعة واستمرت العادة
حتى صارت متجرا لاهل

سمرقند کی خاص چیزوں میں مختلف اقسام
کے کاغذ ہیں، جن کے رواج سے مصر کے
قرطاس اور وہ چمڑے متروک ہو گئے
ہیں، جن پر پہلے زمانہ کے لوگ لکھا کرتے
تھے، کیونکہ کاغذ (اُن کے مقابلہ میں)
بہتر اور زیادہ نرم اور ملائم ہے، اور
تحریر کے لئے زیادہ موزوں و موافق ہے،
یہ کاغذ سمرقند اور چین کے سوا اور کہیں
نہیں ہوتا، اور کتاب المسالک والممالک
کے مصنف نے لکھا ہے، کہ زیاد بن صالح
چین سے سمرقند کی طرف جن قیدیوں
کو پکڑ لایا تھا، اُن میں بعض ایسے لوگ
تھے، جنھوں نے وہاں کاغذ سازی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۰) نے اس واقعہ کی کیفیت کو کسی اور معتبر مصدر سے اخذ کیا ہے، کیونکہ اس کے بیان کی تصدیق چینی تواریخ سے بھی ہوتی ہے،

سمرقند فعم خیرها والارتفاق
بها فی الآفاق،
(لطائف المعارف مطبوعہ مصر ص ۲۱۸)

شروع کردی، پھر اس صنعت نے بڑا
فروغ پایا، اور مدت تک جاری رہی
یہاں تک کہ اہل سمرقند کاغذ کی
تجارت کرنے لگے، اور اس کا فائدہ
اور استعمال تمام ملکوں میں عام ہوگیا،

اسی مفہوم کو ابو الریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) نے ان مختصر الفاظ میں ادا کردیا ہے،

الکواغیدُ لاھل الصین وانما
احدث صنعتها بسمرقند سبیٌ
منهم، ثم عُمِلَ منهُ فی بلاد
شتی فکان سدًّا من عوزٍ
(کتاب الہند ص ۸۰)

کاغذ اہل چین کے ساتھ مخصوص
تھا، اور اس کی صنعت کو سمرقند
میں چینی اسیروں ہی نے جاری کیا
تھا، پھر دیگر ملکوں میں بھی کاغذ
بنایا گیا، جس سے لوگوں کی ضرورت
پوری ہوئی،

ابو عبداللہ زکریا ابن محمد قزوینی متوفی ۶۸۲ھ نے اپنی کتاب آثار البلاد واخبار العباد
(مطبوعہ گوٹنا، ۱۸۴۸ء ص ۲۶۰) میں سمرقند کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ثعالبی کے
مندرجہ بالا بیان کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے،
عرب مصنفین کے بیانات کی تصدیق چینی تواریخ سے بھی ہوتی ہے، ان کا بیان ہے کہ ترک
ہمیشہ عربوں سے برسرپیکار رہتے تھے، جولائی ۷۵۱ء میں عربی امیر زیاد بن صالح نے ایک معرکہ میں
نہ صرف ترکوں کو شکست دی، بلکہ اس چینی لشکر کو بھی ہزیمت دی، جسے فغفور چین نے کوریا کے

۱؎ ہوسکتا ہے کہ غِلّ کا لفظ خِلّ کی تصحیف ہو،



ایک سپہ سالار کاؤسین چاؤ کے جھنڈے تلے ترکوں کی امداد کے لئے بھیجا تھا[۱]،
غرض چینیوں کی آمد سے سمرقند میں کاغذ سازی کی صنعت جاری ہوگئی، اور اس کو رفتہ
رفتہ اتنا فروغ ہوا کہ اہل سمرقند کاغذ کی تجارت کرنے لگے، اور سمرقند کا نام دور دور تک عمدہ
کاغذ کے لئے مشہور ہوگیا،
خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) اس کے وزیر فضل بن یحییٰ برمکی نے
کاغذ سازی کا ایک کارخانہ بغداد میں قائم کیا، اور چند ہی برس میں وہاں کاغذ اس افراط
سے تیار ہونے لگا کہ فضل بن یحییٰ کے جانشین جعفر بن یحییٰ برمکی نے سرکاری محکموں میں چمڑے اور
قرطاس کی بجائے کاغذ کا استعمال شروع کردیا،
کاغذ کی صنعت سمرقند سے نکل کر رفتہ رفتہ دوسرے اسلامی ملکوں میں پھیلتی گئی، چنانچہ
ابن الندیم نے "ورق خراسانی" کا ذکر کیا ہے، جو مقامی کتان (flax) سے تیار ہوتا
تھا، اسی طرح تہامہ (عرب) کے کاغذ کے کارخانوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو کاغذ کی تیاری میں
نباتاتی ریشوں یعنی گھاس پھوس سے کام لیتے تھے، پانچویں صدی ہجری میں ناصر خسرو اپنے سفرنامہ
میں طرابلس کے کاغذ کا تذکرہ کرتا ہے، اور لکھتا ہے، کہ یہاں کا کاغذ سمرقند کے کاغذ کی مانند
بلکہ اس سے بھی بہتر ہوتا تھا (سفرنامہ مطبوعہ پیرس ص ۱۲)
جب کاغذ کی صنعت مصر میں رائج ہوئی، تو وہاں قرطاس سازی بتدریج بند ہوگئی،
اور کاغذ کے رواج سے قرطاس کا استعمال تیسری صدی ہجری میں رفتہ رفتہ ہر جگہ متروک
ہوگیا، اسلامی ملکوں میں کپاس (cotton)، کتان (Flax) اور
پٹسن (Jute) وغیرہ ریشہ دار اشیاء بکثرت پیدا ہوتی تھیں، مسلمان اقوام نے
کاغذ سازی میں ان سے خوب کام لیا، جس سے کاغذ کی صنعت کو ہر جگہ فروغ حاصل ہوا،

۱؎ Mailla: Histoire General de chine, vol III p 234

اور عمدہ کاغذ بآسانی ارزاں قیمت پر دستیاب ہونے لگا جس سے کتابوں کے نسخے کی اشاعت اور علوم وفنون کی ترقی میں بڑی مدد ملی،

وان قرہ باشق ( Von Karabacek ) ایک قلمی کتاب کا ذکر کرتا ہے جس کا نام عمدۃ الکتاب ہے، اور جس میں کاغذ بنانے کا طریقہ بتایا گیا ہے، یہ کتاب غالباً پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں تالیف ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مسلمانوں نے اس صنعت پر مستقل کتابیں لکھی تھیں چونکہ یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہوسکی، اس لئے میں اس کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کرسکتا

**کاغذ کی صنعت اندلس میں**

کاغذ سازی کی صنعت مغرب کی طرف منتقل ہو کر آخر کار اندلس (اسپین) پہنچی، اور یورپ میں اسپین پہلا ملک ہے، جہاں کاغذ سازی اسلامی عہد میں سب سے پہلے جاری ہوئی

اندلس میں شاطبہ ( Tativa ) کے شہر نے اس صنعت میں خاص نام پیدا کیا، چونکہ شاطبہ کے علاقہ میں اعلیٰ قسم کا کتان پیدا ہوتا تھا، اس لئے اس صنعت نے وہاں خوب فروغ پایا، چنانچہ شریف ادریسی جو چھٹی صدی ہجری کا ایک معروف جغرافیہ نگار ہے، شاطبہ کے بارہ میں لکھتا ہے کہ

"وہاں کاغذ سازی کے کارخانے ہیں، جن میں ایسا اچھا کاغذ تیار ہوتا ہے کہ روئے زمین پر اس کی نظیر نہیں ملتی، اور مشرق و مغرب کے ملکوں میں کثیر مقدار میں برآمد ہوتا ہے"

یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ نے بھی معجم البلدان میں شاطبہ کے عمدہ کاغذ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ویعمل الکاغذ الجید فیھا | یعنی اس شہر میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا |
| ویحمل منھا الی سائر بلاد | ہے، جو اندلس کے تمام دیگر شہروں |
| الاندلس، | میں برآمد کیا جاتا ہے، |

جب اسپین کے عیسائیوں نے شاطبہ کے علاقہ کو دوبارہ فتح کرکے عربوں کو وہاں سے



نکال دیا، تو شاطبہ میں کاغذ سازی بدستور جاری رہی لیکن اب یہ صنعت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی،

اندلس میں شاطبہ کے علاوہ بلنسیہ ( Valencia ) اور طلیطلہ ( Tolado ) کے شہر بھی کاغذ سازی کے مرکز تھے، لیکن عربی حکومت کے زوال کے بعد جب یہ صنعت عیسائیوں کے ہاتھ میں چلی گئی، تو کاغذ کی وہ پہلی سی عمدگی اور نفاست قائم نہ رہ سکی، کیونکہ عیسائیوں کو اس فن میں عربوں جیسی مہارت حاصل نہ تھی،

**کاغذ سازی کا رواج یورپ میں**

بارہویں صدی عیسوی میں قشتالہ ( Castile ) کے عیسائی فرمانرواؤں نے اپنے ہاں شاطبہ کے نمونہ پر کاغذ تیار کیا، اور اس کا استعمال اپنی مملکت میں جاری کیا، پھر تیرہویں صدی میں یہ صنعت اطالیہ میں پہنچی، جہاں فابریانو اور بولونیا ( Bologna ) کے شہروں نے اس فن میں خاص شہرت حاصل کی، چودہویں صدی میں فرانس میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہوئے، اور بعد ازاں یورپ کے دوسرے ملکوں یعنی جرمنی اور انگلستان میں بھی یہ صنعت جاری ہوگئی، بہرکیف چودہویں صدی میں مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں علمی اغراض کے لئے کاغذ کا استعمال عام ہوچکا تھا، اور پندرہویں صدی میں کتابت کے لئے چمڑے کا استعمال رفتہ رفتہ متروک ہوگیا، اسی زمانہ میں جب یورپ میں پرنٹنگ یعنی چھاپے کا فن ایجاد ہوا، تو کتابوں کی طباعت کے لئے اہل یورپ کے پاس خاطر خواہ مقدار میں کاغذ موجود تھا جس سے علوم وفنون کی اشاعت میں بے اندازہ سہولت پیدا ہوئی،

کاغذ کے رواج سے پہلے یورپ کے لوگ کتابوں کی تحریر کے لئے پارچمنٹ یعنی چمڑا استعمال کرتے آئے تھے، لیکن پارچمنٹ گران قیمت اور کمیاب تھا، اس لئے وہاں کے عیسائی پادریوں

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ Les origines du Papier par Andre Blum. Paris, 1932.

اور راہبوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ قدیم یونانی اور لاطینی تصانیف کی عبارتوں کو مٹاتے تھے، اور پھر صاف شدہ چمڑے پر اپنی مذہبی تحریریں یعنی ورد و وظیفے لکھتے تھے، یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا، اور یونان اور رومہ کا قدیم لٹریچر مٹتا رہا[1]، اور اُن کے حکماء، شعراء اور ادباء کی بہت سی کتابیں ہمیشہ کے لئے ناپید ہوگئیں، عربوں نے یورپ میں کاغذ سازی کو رواج دے کر علوم قدیمہ پر بڑا احسان کیا، اگر وہ اہل یورپ کو کاغذ مہیا نہ کرتے، تو کلاسیکل لٹریچر رفتہ رفتہ بالکل نیست و نابود ہو جاتا،

چنانچہ "تمدن عرب" کے مشہور مصنف ڈاکٹر گستاولیبون (Gustve Le Bon) اس بارے میں رقمطراز ہیں:-

"قرون وسطیٰ کے اہل یورپ ایک مدت دراز تک صرف چمڑے ہی پر لکھتے رہے، لیکن وہ اس قدر گراں قیمت تھا کہ اس کی گرانی کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں سخت مشکل حائل تھی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ چمڑا اس قدر کمیاب ہو گیا کہ عیسائی راہبان یونان اور رومہ کے بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کی عبارتوں کو مٹا کر ان پر اپنے اوراد و وظائف لکھتے رہے، اگر عرب نہ ہوتے، اور کاغذ نہ بناتے تو قدیم زمانے کے اکثر علمی شاہکار، جن کے یہ راہب محافظ سمجھے جاتے تھے، ضائع ہو جاتے، ایک ایسی چیز کو دریافت کر کے جو چمڑے کی جگہ کام دے سکے، اور مصری قرطاس کی

---

[1] مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ یونان اور رومہ کے قدیم لٹریچر کے ناپید ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جب عیسائی مذہب نے کئی صدیوں کی جدوجہد کے بعد یورپ میں غلبہ پایا، تو اُن کے مذہبی پیشواؤں نے اس لٹریچر کو اپنے عقائد کے منافی سمجھ کر حتی الامکان جلا کر برباد کیا، اس سے معلوم ہوا کہ جب سپین کے عیسائیوں نے قرطبہ اور غرناطہ کی شاہراہوں میں عربی کتابوں کو چن چن کر جلایا تھا، تو وہ اپنے قدیم دستور کی تجدید کر رہے تھے،



مانند ہو، عربوں ہی نے اشاعت علوم کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے[5]

**کاغذ کا رواج ہندوستان میں**

ہندوستان میں کاغذ کے رواج سے پہلے لکھنے کے لئے مختلف چیزیں کام میں لائی جاتی تھیں، مثلاً تاڑ کے پتے، بھوج پتر، اور سفید ریشمی کپڑا، تاڑ کے پتے لمبائی میں ایک ہاتھ اور چوڑائی میں تین انگل کے برابر ہوتے ہیں، اُن پر لکھنے کے بعد ان کے درمیان سوراخ کرتے تھے، اور ان میں دھاگا ڈال کر ایک شیرازہ میں جمع کر لیتے تھے،

بھوج کے درخت کی چھال خاصی لمبی چوڑی ہوتی ہے، اس پر مہر کشی کرتے تھے جس سے وہ چھال مضبوط اور ملائم ہو جاتی تھی، اس کے ورق الگ الگ ہوتے تھے، اس لئے تحریر کی ترتیب کو قائم رکھنے کے لئے اُن اوراق پر ہندسے ڈال لیتے تھے، اور اُن کو لکڑی کی دو تختیوں کے درمیان باندھ دیتے تھے، اور پھر حفاظت کے لئے کسی کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹ لیتے تھے، اس قسم کی کتاب کو پوتھی کہتے ہیں، اور اس طرح کی پوتھیاں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں،

جس تحریر کو پائدار بنانا مقصود ہوتا تھا، اسے پتھر یا تانبے پر کھود دیتے تھے، چنانچہ مہاراجہ اشوک کے فرمان پتھر پر کندہ کئے گئے تھے، اور ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں، اسی طرح جاگیروں کی سندات ...... جو حکمرانوں کی طرف سے امراء کو عطا ہوتی تھیں، تانبوں کی تختیوں پر منقوش ہوتی تھیں، اس قسم کی تختیاں ہندوستان کے کئی عجائب خانوں میں موجود ہیں،

ہندوستان میں کاغذ کا رواج اسلامی عہد میں ہوا، کاغذ سازی کی صنعت یہاں

---

[5] La civilisation des Arabes par Dr. Gustave Le Bon. Paris. 1884, page 518

غالباً ترکستان یا خراسان سے آئی ہوگی، ابتدا میں لاہور اور دہلی اسلامی حکومت اور حضارت کے مرکز تھے، اس لئے کاغذ سازی کے کارخانے غالباً سب سے پہلے ان ہی شہروں میں قائم ہوئے ہوں گے لیکن ہمارے پاس اس بارے میں کوئی قطعی شہادت موجود نہیں، سب سے پہلی تاریخی شہادت جو میرے علم میں آئی ہے، کشمیر کے بارے میں ہے، تواریخ کشمیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ کشمیر کے بادشاہ سلطان سکندر کا ایک بیٹا شاہی خان تھا، جو امیر تیمور کے حملۂ ہند (۱۳۹۸ء) کے بعد اس کے ہمرکاب سمرقند گیا، اور وہاں کئی سال تک مقیم رہا، جب کشمیر واپس آیا، تو وہ ہر فن کے باکمال کاریگر اپنے ساتھ لایا، ان میں کاغذ ساز اور جلد ساز بھی تھے، جب شاہی خان زین العابدین کے لقب سے کشمیر کے تختِ حکومت پر بیٹھا، تو اُس نے ان کاریگروں کی سرپرستی کو شاہانہ انداز میں جاری رکھا، کشمیری لوگ بڑے ذہین اور چابکدست کاریگر ہیں، انہوں نے کاغذ سازی کے فن میں بڑی ترقی کی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں کشمیر میں ایسا عمدہ اور نفیس کاغذ تیار ہونے لگا کہ شاہانِ کشمیر دوسرے ملکوں کے حکمرانوں کے پاس اپنے ملک کے نوادر کے ساتھ اپنے ہاں کا بنا ہوا کاغذ بھی بطور تحفہ بھیجنے لگے،

کاغذ کی صنعت رفتہ رفتہ ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ میں جاری ہوگئی، اور تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ، بہار، بنگالہ اور گجرات میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہو چکے تھے، اور ہر ایک خطہ کے کاغذ کی خاص خاص صفات تھیں، کیونکہ مختلف علاقوں میں کاغذ کی ساخت میں جو اشیاء استعمال کی جاتی تھیں، ان میں خاصا اختلاف تھا، مثلاً بنگال کے کاغذ ساز بیشتر اپنے صوبہ کا پٹسن (Jute) کام میں لاتے تھے، اور اودھ والے بانس کا ریشہ استعمال کرتے تھے، ممکن ہے بنانے کے طریقہ میں بھی اختلاف ہو، چنانچہ احمد آباد (گجرات) کا کاغذ سفید اور چکنا، اور اودھ کا کاغذ دبیز اور پائدار ہوتا تھا،



اس صنعت میں پنجاب بھی دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں رہا، سیالکوٹ میں کاغذ سازی کے بہت سے کارخانے تھے، اور ان میں جو کاغذ تیار ہوتے تھے، ان کے الگ الگ نام تھے، سیالکوٹ کشمیر کی سرحد پر واقع ہے، اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ کاغذ سازی کی صنعت وہاں غالباً کشمیر ہی سے آئی ہوگی، سیالکوٹی کاغذ سفید، مضبوط اور ملائم ہوتا تھا، اور تمام صوبہ میں برتا جاتا تھا، اور بیوپاریوں کے بہی کھاتوں کے لئے خاص طور پر کام میں آتا تھا، خلاصۃ التواریخ کا مؤلف منشی سجان رائے بٹالوی (۱۱۰۱ھ) سیالکوٹ کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس شہر میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے، جو سفید، صاف اور پائدار ہے، خصوصاً وہ اقسام جو خاصہ جہانگیری اور مان سنگھی کے نام سے مشہور ہیں"۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ اور ان کے امراء دیگر صنعتوں کے علاوہ کاغذ سازی میں بھی دلچسپی لیتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کی توجہ اور شاہانہ سرپرستی سے اس فن کو فروغ حاصل ہوا ہوگا،

---

# غوری

از

جناب پروفیسر سیّد امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

بیشتر تذکرہ نویسوں نے گیارھویں صدی ہجری کے ایرانی شعراء میں ایک شاعر غوری کا ذکر کیا ہے اور اس کو کاشی تبلایا ہے، مگر بعض تذکروں میں دوسرے غوری کا بھی ذکر کیا گیا ہے، کلمات الشعراء کے مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ میں صرف غوری لکھا ہوا ہے، مگر ان کی جانب جو اشعار منسوب ہیں وہی اشعار اس تذکرہ میں میر برہان عودس کی طرف منسوب ہیں، نیز حاشیہ میں لکھا ہے کہ دوسرے نسخہ میں عودس کا تخلص عزلت ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے ان دونوں کو ایک کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں دو ہم عصر شاعر تھے، جن کا تخلص غوری تھا، اور دونوں کاشان کے رہنے والے تھے، ان میں سے ایک ہندوستان آئے، اور دوسرے ایران ہی میں رہ گئے، کلمات الشعراء میں دونوں کا ذکر ہے، اور دونوں کو کاشی کہا گیا ہے تذکرۂ کاتب میں ایک کو غوری کاشی اور دوسرے کو جو ہندوستان آئے تھے، میر غرور کاشی کہا گیا ہے مؤلف مخزن غرائب نے بھی ہندوستان آنے والے غوری کو میر غرور کاشی لکھا ہے، مؤلف ریاض الشعراء نے ہندوستان والے کو میر غروری کاشی ...... اور دوسرے کو غروری کاشی لکھا ہے،

ملا غوری کاشی کو نصر آبادی نے احتمالاً شیرازی بتایا ہے، اور اُن کی بڑی تعریف کی ہے



اور لکھا ہے کہ وہ دنیاوی چیزوں سے پرہیز کرتے تھے، اسی لئے اسّی برس کی عمر پائی، اور بقول اُن کے وہ زندہ دل انسان تھے، اور اکثر صاحبانِ حال کی خدمت میں رہا کرتے تھے، آخر عمر میں اصفہان کے ایک قہوہ خانے میں رہنے لگے تھے، جہاں لوگ ان سے ملاقات کرتے تھے، ان کا ذریعۂ معاش جدول کشی اور رتالی تھا، نصر آبادی کے والد سے اُن کے اچھے تعلقات تھے، اور وہ اپنے والد کے ساتھ اُن کے پاس جایا کرتے تھے، شاہ صفی کی حکومت کے آخری زمانے میں انھوں نے انتقال کیا، انہی غوری نے مثنوی تحفۃ العراقین کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی، اس کے معراج کے اشعار کو تذکرہ نصر آبادی میں نقل کیا ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے:-

شد زآمدنش چو چرخ آگاہ      پر کرد ز شمع و مشعلش راہ

مؤلف خزانۂ عامرہ نے ان کو قطعاً شیرازی تبلایا ہے، اور نصر آبادی کے حوالے سے ایک شعر نقل کیا ہے،

یہ شعر شاہ عباس ماضی[1] کے کتابدار صادق بیگ نقاش[2] کی مدح میں کہا تھا، اور قہوہ خانے میں اُن کو سنایا تھا:-

چوں عرصۂ زنگ است وصدائے زنگ است      صیت سخن تو در جہان امکال

یہ بھی لکھا ہے کہ جب غوری نے یہ شعر پڑھا تو صادق بیگ نے مسودہ اُن کے ہاتھوں سے لے لیا اور کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں ہے، مؤلف تذکرہ نے

---

لے سنہ ۹۸۵ھ / سنہ ۱۵۸۷ء - سنہ ۱۰۳۶ھ / سنہ ۱۶۲۶ء

ٹے ناظم تبریزی نے لکھا ہے کہ صادق بیگ کی جامعیت کے لحاظ سے کوئی برابری نہیں کر سکتا، اگرچہ ہر صنف میں شعر کہا ہے، مگر اُن کی مثنوی اور قصیدے غزلوں سے بہتر ہوتے ہیں،

یہ بھی لکھا ہے کہ اس شعر کا وزن ایرانیوں کا نکالا ہوا ہے، اور اچھا نہیں ہے، مؤلف ریاض الشعراء نے ان غوری کو کاشی بتایا ہے، اور لکھا ہے "در نہایت افتادگی وکمال مسکنت بودہ"[1]

دوسرے غوری وہ ہیں جن کو سب نے کاشی لکھا ہے، یہ تقی اوحدی کے معاصر اور صاحب دیوان تھے، تقی اوحدی ان سے ایران و ہندوستان دونوں جگہ ملے تھے، تذکرہ میر علاء الدولہ نے ان کے دیوان کے اشعار کی تعداد تین ہزار بتائی ہے،

فانوس خیال میں اُن کو میر برہان غوری تبلایا گیا ہے، اور لکھا ہے کہ ہندوستان آکر انھوں نے اپنا تخلص برہان کر لیا تھا، اسی تذکرہ میں ان کو "نادرہ گو، شیریں سخن"[2] کہا گیا ہے، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ فن سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے، اُس کے بیان کے مطابق غوری کاشان کے مشہور سادات میں تھے، مگر ابتداء عمر میں شیراز چلے گئے، اور وہاں مدتوں مقیم رہے، اور وہاں کی ممتاز شخصیتوں سے اُن کے تعلقات رہے، شیراز سے غوری ہندوستان آئے، یہاں آنے کے سبب کا ذکر آیندہ آئے گا، مؤلف میخانہ نے غوری کو "مجموعہ نکتہ دانی"[3] لکھا ہے، اور اُن کے اشعار کے بارہ میں لکھا ہے کہ اچھے اور پسندیدہ ہوتے ہیں، لیکن اکثر مضامین متقدمین اور متاخرین سے ماخوذ ہیں[4]، عبد النبی مولف میخانہ نے انھیں نہیں دیکھا تھا، لیکن اُن کے بعض ساتھیوں سے ان کے حالات تحقیق سے معلوم کئے تھے، اُن کے قول کے مطابق غوری کاشان سے شیراز اور وہاں سے لار گئے، اور قبل اس کے کہ لار شاہ عباس کے قبضہ میں آئے، انھوں نے انوری[5] کا ایک قصیدہ اپنے نام سے وہاں کے بادشاہ کی شان میں پیش کر دیا، اس پر انھیں انعام ملا، اس کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے، مگر جب پھر عراق پلٹے، تو ان کے آنے سے پہلے ہی یہ راز فاش ہو گیا، اور لوگوں نے ان کا اتنا مذاق اُڑایا کہ ان کو ایران چھوڑ کر ہندوستان

[1] ورق ۲۰۲، [2] ورق ۹۲، [3] ورق ۴۰، [4] ورق ۴۰، [5] متوفی در حدود ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء



آنا پڑا، مؤلف میخانہ کے زمانہ میں غوری ہندوستان کی سیاحت میں مشغول تھے، انھوں نے اُن کے ساقی نامہ کی تعریف کی ہے، اور اس کو نقل کیا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے،

ثنا می کنم پیر میخانہ را      تجلی دہ طور پیمانہ را

اس مثنوی کے کچھ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

ز شرم رُخِ ساقیِ گرم خوی      خوی خجلت از شبنم آرد بروی

مشو خرّم از عارضِ تابناک      کہ گل ہم ازیں غصہ زد جامہ چاک

مہِ عارضش شمع کاشانہ بود      تجلی در آں بزم پروانہ بود

بُتِ سرکش مجلس آرائے من      ہماں برق کشت تمنائے من،

میخانہ کے لاہور والے مطبوعہ نسخہ میں اس مثنوی کے ۱۵۰، اور طہران والے نسخے میں ۱۷۹، اشعار ہیں،

غوری کے بارہ میں پروفیسر شفیع کو بھی اشتباہ ہوا ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالباً یہ دونوں غوری ایک ہیں، میخانہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ پتہ نہیں وہ کون سے غوری ہیں، جن کا یہ ساقی نامہ ہے، مؤلف مخزن نے کاشان کے دو غوری کا ذکر کیا ہے، اور انھوں نے اور مبتلا نے یہ شعر نقل کیا ہے،

بایدکہ تو برنہ گردی از من      سہل است کہ روزگار برگشت

اسی شعر کو آزاد نے خزانہ عامرہ میں غوری شیرازی کی طرف منسوب کیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ غوری کاشی اور شیرازی ایک ہیں[1]،

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ غوری شاہجہاں[2] کے زمانہ میں ہندوستان آئے،

[1] میخانہ ص ۴۵، [2] ۱۰۳۷ھ / ۱۰۶۸ھ / ۱۶۲۸ - ۱۶۵۸ء

مگر فانوس خیال میں ہے کہ ہندوستان آکر پہلے وہ عبدالرحیم خانخاناں[1] کے مداحوں اور ملازموں میں شامل ہوئے، یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، خانخاناں نے جہانگیر[2] کے زمانہ میں انتقال کیا، اس لئے غروری شاہجہاں کے عہد سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوں گے، اس قول کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ تقی اوحدی اُن سے ہندوستان میں بھی ملے تھے، تقی اوحدی نے ...... ۱۰۳۰ ہجری/ ۲۱-۱۶۲۰ء میں انتقال کیا، اس لئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ شاہجہاں کی تخت نشینی سے پہلے جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آگئے تھے۔

شمالی ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد غروری دکن گئے، اور وہاں کے عرفا کے ساتھ اپنا وقت گذارنے لگے، دکن کے بادشاہ کی مدح میں کہتے ہیں :۔

طبع را در عہد بذل خسرو مالک رقاب چوں لواہا فتح خاقانِ دکن آراستم

مؤلف ریاض الشعراء اور نشتر عشق کے قول کے مطابق غروری نے ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

کلمات الشعراء کے میر برہان عروس، غروری اور غزلت ایک ہیں جو ہندوستان آئے تھے، اس لئے کہ جب ذیل شعر جو اس تذکرہ میں دو جگہوں پر عروس اور غروری کی طرف منسوب ہے، وہی ہے جو مخزن میں ہندوستان آنے والے غروری کاشی کے نام سے نقل کیا گیا ہے،

بہر زیبِ دل زتن بنمو استم گلہائے داغ صد چمن بر ہم زدم تا یک قفس آراستم

ناظم تبریزی نے بھی انہی غروری کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان آئے تھے، اس لئے کہ جب ذیل شعر جو تذکرۂ نظم گزیدہ میں ہے وہی ہے جو تذکرۂ اشرف علی میں ہے، جس میں تصریح ہے کہ

---

[1] ۹۶۴ھ - ۱۰۳۶ ہجری/ ۱۵۵۶ - ۱۶۲۷ عیسوی

[2] ۱۰۱۴ھ - ۱۰۳۶ ہجری / ۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ عیسوی،



وہ ہندوستان آئے تھے،

گم نیافتہ باز نظارۂ رو دیش کہ سوے دیدہ نگہ شرمسار می آید

ناظم تبریزی نے اُن کو "سید با ادراک"[1] بتایا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ اُن کے اشعار مشہور ہیں، مگر اُن کی نظمیں دقیق ہوتی ہیں"[2]

کابل میوزیم میں دیوان غروری کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے[3]، اس میوزیم کی قلمی فہرست اور فرانسیسی زبان کی مطبوعہ فہرست میں جو اس قلمی فہرست پر مبنی ہے اس کو دیوان غروری شیرازی کہا گیا ہے، اس قلمی فہرست میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس دیوان میں ایک قصیدہ شاہجہاں اور اورنگ زیب[4] کی مدح میں ہے،

بہرحال اتنا مسلّم ہے کہ اس دیوان والے غروری وہی ہیں جو ہندوستان آئے تھے، اور یہاں کے بادشاہوں کی مدح میں قصیدے کہے تھے، مگر ان غروری کو شیرازی کہنا صحیح نہیں ہے اگرچہ وہ شیراز میں بھی رہے تھے، بہتر بھی یہ ہے کہ ان کو کاشی ہی کہا جائے، دوسرا ثبوت اس شاعر کے شیرازی نہ ہونے کا یہ ہے کہ خود اس دیوان میں کہیں بھی شیراز کا ذکر نہیں ملتا، اس کے مقابلہ میں کاشان کی بار بار مدح کی گئی ہے،

بلبلم دشمن جاں گشتہ و دہقاں بدخواہ بس کہ ہر جا صفتِ گلشن کاشاں کردم

زیں بس زصوت بلبلِ کاشاں بیاں خوش است تا کے حدیثِ طوطیِ ہندوستاں کنی

دیوان غروری کا یہ نسخہ بالکل ناقص اور خراب حالت میں ہے، مگر بہت نادر ہے، اس لئے کہ اب تک اس کے کسی دوسرے نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا،

اس ناقص دیوان میں بہت سی غزلیں ہیں، جو ردیف الف کے اس شعر سے شروع

---

[1] ص ۱۰۹ [2] ایضاً [3] نمبر ۲۲۹ [4] ۱۰۶۸ھ - ۱۱۱۸ ہجری/ ۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ عیسوی،

ہوتی ہیں :-

دیدہ بکینہ دلم بستہ کہ عجب مدار
طفل مریض اگر شود دشمن جان حکیم را

دیوان کے مطالعہ سے غوری کی شخصیت کے کچھ نئے گوشے سامنے آتے ہیں، جن کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا ہے، غوری کو بھی دوسرے شعراء کی طرح اپنے ہنر پر فخر ہے :-

آنجا کہ غوری شود از انشا غزل خواں
گرمست ترنم نشوی مست سخن باش

تسخیر جہاں دارد غوری تہرتم
مسند فطرت بقدر دسترس آراستم

وہ اپنی بے طالعی کے شاکی نظر آتے ہیں :

از دوست چساں شکوہ تواں کرد غوری
بے طالعی اہل ہنر رسم قدیم است

طعنہ سرگشتگی از غیر نتوانم کشید
منکہ غربت را بعہد زیب وطن آراستم

انھوں نے حافظ کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کا خیال ہے کہ حافظ کا تتبع نہیں ہو سکتا،

کمن تتبع حافظ غوری از کہ کہی
بخواں بر وکہ رموز سخنوری داند

حافظ کے کلام کے علاوہ وہ گلشن راز جیسی مثنوی سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں :

کمال شیخ از غوری میسر نیست
کہ مو بمو نتوانم شرح گلشن راز است

آید برقص روح غوری بزیر خاک
ہر جا حدیث گلشن تبریز می کند

غوری نے غزلوں میں مرزا عبداللہ شکوہ اور عبدالحسین نامی اشخاص کی تعریف کی ہے، غوری کے اشعار زیادہ تر متوسط درجہ کے ہیں، نمونۃً کچھ منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں :

از داغ سوختم دل حسرت نصیب را
آراستم ز گل قفس عندلیب را

قبلہ نماز خود شان جہاں یوسف بود
او ہم از طور تو آئین زلیخا برداشت



وا زندہ بے سبب بغوری چہ طعنہا،
جمعی کہ غارت چمن ہوش کردہ اند

این شفق نیست کہ آرایش گردوں شدہ است
قدسیاں بہر شہیداں کفنے ساختہ اند

از دل سخت بتاں شکوہ مکن
سنگ از دیدہ تمنا کی زن

از ذوق لذت اگر می طلبی،
سینہ بر خنجر بیبا کی زن

ان ناقص غزلوں کے بعد کچھ قطعات ہیں، جن میں آصف[1] (غیاث ملت و دین) خان جہاں[2] مرزا بانی کی مدح کی گئی ہے، اور ابوالوفا نامی ایک شخص کی جسکو غالباً ایک رباعی میں مولوی کہکر یاد کیا گیا ہے، ہجو کی گئی ہے۔ قطعوں کے بعد ایک مختصر سی مثنوی ہے، جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے،

باز طبعم شرر فشاں شدہ است
شعلہ کلک مرا زباں شدہ است

اس میں بھی کسی اسد نامی شاعر کی مذمت کی گئی ہے،

اس مثنوی کے بعد پھر کچھ قطعات ہیں، ان میں شاہ انجو، آصف خاں، ابوالقاسم، میر سعد الدین ابراہیم اور ایک خرگوش کی موت اور ایک عمارت ایک گھر شاہی حمام کسی خان کی بنائی ہوئی مسجد کی تاریخیں اور بعض لوگوں کی ہجویں ہیں، قیاس خیال میں ہے کہ غوری مرشد[1] بروجردی کے دوست تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کے تعلقات خراب ہو گئے تھے اور ہجو کی نوبت آگئی تھی، اس ہجو کے کچھ اشعار دیوان میں موجود ہیں،

اس کے بعد رباعیات ہیں جو اصناف سخن کی طرح ناقص ہیں، ایک رباعی نمونۃً پیش کی جاتی ہے،

ای روح مقدس بسجود ست سر گرم
کونین ز شرم نکہت در از رم

خورشید صفت گرم در آئینہ مبیں،
آئینہ مبادا کہ شود آب از شرم

ایک رباعی میں شاعر نے اپنا تخلص برہان بتایا ہے، "برہان تو زو سواس ہوس"

ایک رباعی میں قافیہ مسعود کی تمجید کی گئی ہے، اس کے بعد قصائد ہیں یہ حصہ بھی ناقص ہے، ان قصائد میں شاہجہاں اورنگ زیب جمال الدین شاہ انجو اور پیغمبر کی مدح کی گئی ہے،

[1] مرشد بروجردی یا یزد جردی متوفی ۱۰۳۵/۲۱-۱۶۲۰ء

آخر میں ایک ترجیع بند ہے، جس کا یہ شعر ہر بند کے بعد دہرایا گیا ہے،

بنشینم و لے تو چند باشم ہم آتش و ہم سپند باشم

قصائد کے آخر میں بھی کچھ غزلوں کے اوراق آگئے ہیں :۔

فہرست مآخذ ۱۔ قدرت اللہ شوق : تکملۃ الشعراء نسخۂ خطی شمارہ ۲۴۴۱ کتبخانہ رامپور، (۲) مرزا محمد علی کاتب : تذکرۂ کاتب نسخۂ خطی شمارہ، ۲۴۴۲۵، رضا لائبریری رامپور (۳) احمد علی ہاشمی : مخزن الغرائب نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری؛ (۴) مرزا محمد طاہر نصیرآبادی : تذکرہ نصرآبادی چاپخانۂ ارمغان تہران (۵) محمد افضل سرخوش، کلمات الشعراء دین محمد پریس لاہور، (۶) میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور (۷) میر علاء الدولہ اشرف علی خان : تذکرۃ الشعراء نسخۂ خطی، شمارہ ۲۴۵۹، کتابخانہ رامپور، (۸) سیف الدین محمد فاروقی خیال نسخۂ خطی شمارہ ۹۲۵/۲۵ علی گڈھ یونیورسٹی (۹) کشن چند اخلاص : ہمیشہ بہار نسخۂ خطی شمارہ ۱۸۰۹ خدا بخش لائبریری، (۱۰) تذکرۃ الشعراء نسخۂ خطی شمارہ ۲۴۵۶، رامپور، (۱۱) ناظم تبریزی : نظم گزیدہ نسخۂ خطی، شمارہ ۹۲۵ علی گڈھ یونیورسٹی (۱۲) سید علی حسن خاں : صبح گلشن، مطبع شاہجہانی، بھوپال، (۱۳) علی قلی خاں والہ داغستانی : ریاض الشعراء نسخۂ خطی، شمارہ ۴۵-۳۷۰، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، (۱۴) حسین قلی خاں عظیم آبادی : نشتر عشق، نسخۂ خطی شمارہ ۲۰۱۲ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی، (۱۵) ملا عبد النبی، فخر الزمانی : تذکرۂ میخانہ باہتمام احمد گلچین معانی، ۱۳۴۵ شرکت نسبی حاج محمد حسین، دفتر کار اقبال، (۱۶) ملا عبد النبی فخر الزمانی، تذکرۂ میخانہ، محمد شفیع، کپور آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور،

(۱۷) S. De lau gier De Beaure cuell : Manuscript D Afghanis. tau Le Caire, 1964



# مطبوعاتِ جدیدہ

**سلوک سلیمانی** مرتبہ مولانا محمد اشرف خاں صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۸۴ مجلد مع دیدہ زیب گردپوش، قیمت للعہ پیسے، مکتبہ سرمدی، ۶۷-اسلامیہ پارک سکیم نمبر ۳ چوبرجی روڈ لاہور،

حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت علم و عرفان اور شریعت و طریقت دونوں کی جامع تھی، عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے سلوک و عرفان میں بھی امتیازی درجہ حاصل کر لیا تھا، اور اس راہ میں بھی ان سے بڑا فیض پہنچا، ان کے مسترشدین میں مولانا محمد اشرف خاں صاحب صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، انھوں نے معارف کے سلیمان نمبر کیلئے سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر، کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو طوالت کی وجہ سے خاص نمبر کے بجائے بعد میں بالاقساط شائع ہوا تھا، اب انھوں نے افادۂ عام کے خیال سے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، سید صاحب کے سلوک پر لائق مرتب نے ایک اور ضخیم کتاب بھی لکھی ہے، جو آیندہ شائع ہوگی، زیر نظر کتاب میں انھوں نے سید صاحب کے عارفانہ اشعار، ملفوظات، تربیتی مکتوبات اور متعدد دوسری تحریروں سے ان کے نظریۂ سلوک و عرفان کی وضاحت کی ہے، کتاب کے ابتدائی نصف حصہ میں سلوک و تصوف کے متعلق سید صاحب کا نقطۂ نظر اور آخری حصہ میں اس کی اہم خصوصیات و کیفیات اور واردات وغیرہ کی حقیقت و اہمیت تحریر کی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب سلوک سلیمانی بلکہ سلوک اشرفی کا ایک جامع

خاکہ اور سلوک و عرفان کی اصل حقیقت کا مرقع ہے، فاضل مرتب نے مقدمہ میں سید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے جلوؤں اور مختلف النوع کمالات کے دلکش پہلوؤں کے ذکر کے سلسلہ میں ان کی سلوک و تصوف سے ابتدائی دلچسپی اور ان کی زندگی میں اس کے تدریجی ارتقار کا بھی ذکر کیا ہے، سید صاحب کے علوم ظاہری میں کمالات کے مقابلہ میں ان کی باطنی و روحانی زندگی کے گوشے نمایاں نہ تھے، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے، اور اس سے انکے روحانی و باطنی زندگی کے کمالات کا پورا مرقع سامنے آ جاتا ہے، طرز تحریر دلکش ہے، غلام محمد صاحب نے معارف کے سلیمان نمبر کے متعلق غلطی سے لکھا ہے کہ یہ ستمبر ۵۴ء میں شائع ہوا تھا، یہ صحیح نہیں ہے، یہ نمبر مئی ۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

## تعلیمی مقالات (۱)

مرتبہ مجلس تعلیمات پاکستان تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۴ قیمت عہ پتہ مجلس تعلیمات پاکستان ۵ علامہ اقبال روڈ (شبلی کالج) لاہور ۵۔

پاکستان کے ادارہ مجلس تعلیمات کا مقصد نظام تعلیم میں ایسی مفید تبدیلیاں عمل میں لانا ہے جو دین سے بے تعلقی اور دین و دنیا میں دوئی کے رجحان کو ختم کرکے طلبہ و اساتذہ کو اسلامی افکار و اقدار کا حامل بنا سکیں، اس ادارہ کی ماہانہ نشستوں میں مختلف علمی و تعلیمی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے ہیں، یہ مجموعہ ان نشستوں کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین غور و فکر سے لکھے گئے اور بصیرت افروز ہیں، اور ان میں مختلف علمی و تعلیمی مسائل پر بہت مفید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جن سے معاشرہ و افراد کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کی اہمیت اسکو زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کی تدبیریں اور درس و تدریس کے بارہ میں مفید رہنمائی ملتی ہے، ایک مضمون میں مسلمانوں کی ریاضی میں خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے "کیا درس نظامی محض ایک دینی نصاب ہے (حافظ نذر احمد) اور جدت اور تعلیم (سید علی شبر کاظمی) خصوصیت سے مفید اور دلچسپ مضامین ہیں، یہ مجموعہ خصوصیت سے تعلیم و تدریس سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، "ض"

جلد ۱۰۶۔ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء۔ عدد ۶

# مضامین